بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یہ آج سے ستاون سال قبل کی بات ہے!

جشنِ آزادی 1948ء

تشکیلِ پاکستان کے بعد' طلوع اسلام نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ وہ ہر سال' جشنِ آزادی (14 اگست) کی تقریب پر' ایک خصوصی مقالہ میں' ملی جائزہ لیا کرتا تھا اور اس احتساب خویش سے' قوم کو بتایا کرتا تھا کہ ہم نے اس ایک سال میں کیا کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اس نے' جشنِ آزادی (1948ء) کی تقریب پر جو جائزہ لیا تھا' اسے آئندہ صفحات میں بجنسہٖ پیش کیا جاتا ہے' اس مقصد کے ساتھ کہ ہم اس آئینے میں اپنے خط و خال دیکھیں اور اس امر کا جائزہ لیں کہ آج ٹھیک ستاون سال بعد ہماری حالت کیا ہے۔

اس جائزہ کا آغاز

نذرِ عقیدت

سے کیا گیا تھا جو درج ذیل ہے۔

''بیسویں صدی کے آغاز سے 1930ء تک' مسلمانانِ ہند کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ قوم نہیں ایک ناقہ تھی بے زمام' ایک کارواں تھا بے منزل و بے سالار' ان کی سعی و عمل بگولے کے رقص اور سمندر کی لہروں سے زیادہ نتیجہ خیز نہ تھی کہ اس محشرستانِ تشتت و انتشار میں اللہ کا ایک بندہ اٹھا جسے مبداء فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ دانشِ نورانی'' کی طرح متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز کیا تھا۔ اس نے قافلے کے منتشر افراد کو للکارا اور کہا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تمہاری منزل کونسی مقرر کی ہے اور ہندوستان کے احوال وظروف کے پیش نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کون سی راہ سیدھی ہے۔ اس نے گردوپیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور الٰہ آباد کے مقام پر کھلے اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی

ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ (خطبۂ صدارت 1930ء۔ علامہ اقبالؒ)

پھر اس کی نگہِ دوررس ایک ایسے صاحبِ فراست و اخلاص کی متلاشی ہوئی جو ملتِ اسلامیہ کی اس متاعِ بُردہ کی بازیافت کے لئے مقدمہ لڑے اور قوم کو راہ میں فروخت ہی نہ کر دے۔ 1937ء میں اس نے یہ دستاویز ایک ایسے آزمودہ کار، صاحب دیانت و اخلاص وکیل کے ہاتھوں میں دے دی جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ دنیا نے اسے محمد علی جناح اور ملت نے قائداعظم کہہ کر پکارا۔ (علیہ الرحمتہ)۔

اس نحیف و ناتواں رہبر نے جس تدبر و فراست اور اخلاص و دیانت سے اس مقدمہ کو لڑا، دنیا کی عدالتیں اس پر متعجب و حیران ہیں۔ اللہ نے اس کے حسن نیت کو متاع کامرانی سے نوازا اور اگست 1947ء میں وہ قوم کے حق میں ڈگری لے کر احاطۂ عدالت سے باہر آیا۔

ملتِ اسلامیہ اس مفکرِ اعظمؒ اور اس قائداعظمؒ کی بارگاہِ عالیہ میں حسنِ عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کا فخر حاصل کرتی ہے۔''

☆☆☆

اس کے بعد، احتسابِ خویش پر مشتمل جائزہ ملاحظہ فرمائیے۔

جشنِ آزادی 1948ء

آزادی کی دیوی: ''انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو الٹتے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں تک کے ازمنۂ مظلمہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے، طرز بود و ماند بدلے گا، اسلوبِ رفتار و گفتار بدلے گا، لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تباین اور امصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور، بلاتخصیص زمان و مکاں ہمیشہ شردھا کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی ایک دور میں بھی ایسا گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نمارید و فراعنۂ زماں اور اکاسرہ و قیاصرۂ دہر،

ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کمزور انسانوں کے سینہ سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ اس نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگ ساحل پر اَن گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر ساتھ لے گئیں۔ لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی نہ مٹ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کے نام کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی یا پھر اس باعثِ ننگ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہرحال دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانے سے ناپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے بایں غط کہ آزادی دنیا کے ہر لغت میں شرف و مجد انسانیت کے مرادف اور غلامی' ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی بالآخر ہے کیا' جو انسان کے لئے اس درجہ مرغوب و مقصود بن چکی ہے۔ اگر وہ یہی آزادی ہے جس کا غلغلہ ہم بھی ایک سال سے سن رہے ہیں تو ہمیں حیرت ہے کہ انسان کو کیا ہو گیا کہ اس نے اس کی خاطر زمین اور آسمان کو ایک کر رکھا ہے۔

ہماری آزادی: ہم گزشتہ ایک سال سے آزاد ہیں۔ پچھلے سال بھی 15 اگست کو ہم نے آزادی کا جشن منایا۔ آج امسال پھر ویسا ہی جشنِ آزادی منا رہے ہیں۔ آزادی کا یہ تہوار اب ہر سال منایا جایا کرے گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے اس ظاہری شور و غوغا اور سطحی دھوم دھام کے ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ہم وہی کچھ ہیں جو 15 اگست 1947ء سے پہلے تھے۔ ہم وہیں ہیں جہاں اس تاریخ آزادی کے وقت تھے۔ بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی کچھ پیچھے۔ ہم اب آزاد ہیں۔ قانونی اور آئینی معنوں میں پوری طرح آزاد۔ لیکن کیا آزادی کے نتائج یہی کچھ ہوتے ہیں جن سے ہم دوچار ہیں؟ کیا یہی وہ آزادی ہے جس کے نغمے فطرتِ انسانی کے ساز سے ہمیشہ ابھرتے' ابلتے رہتے ہیں؟ کیا ہم خود اسی آزادی کا مطالبہ کیا کرتے تھے؟ اگر آزادی اسی کیفیت (بلکہ عدم کیفیت) کا نام ہے تو ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ تاریخ کی رصدگاہوں کے تمام نقوش باطل ہیں' یا ہم ہی نے کہیں دھوکا کھایا ہے۔

کہنے کو ہم آزاد ہیں۔ ہر معنی میں آزاد۔ لیکن ہمیں سال بھر میں ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اس آزادی نے ہم میں کونسی تبدیلی پیدا کی کہ جس کے باعث ہم اس آزادی کی زندگی کو سابقہ غلامی کی زندگی پر ترجیح دیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس بظاہر آئینی آزادی میں کسی ایسی شے کی کمی ہے جس سے آزادی اور غلامی میں

چنداں امتیاز نظر نہیں آتا۔ آیئے دیکھیں کہ ''سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے'' کے مصداق کون ''تو'' ہم میں نہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اس ہیملٹ کی داستان میں وہ کون سا شہزادہ گم ہے جس سے یہ داستان اس درجہ بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔

1931ء کی مسلم کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے کہ اربابِ کانفرنس نے ایک مفکر (Visionary) کو صدارت کے لئے چنا ہے' علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ:

قومیں فکر سے محروم ہو کر برباد ہو جاتی ہیں!

فکر سے محرومی: آج ہماری یہی کیفیت ہے۔ ہم سیاسی آزادی سے تو ہمکنار ہو چکے ہیں لیکن فکر سے محروم اور تہی ہیں۔ آزادی' غیروں کی غلامی (سیاسی استیلاء) کی عدم موجودگی کی سلبی کیفیت کا نام نہیں۔ آزادی' ایک مثبت شے ہے۔ یہ تنہا لا الہ کی وادی میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ گلستانِ الا اللہ کی دائمی بہار ہے۔ آزادی ظلمت نہیں کہ عدم نور کا نام ہو بلکہ یہ نور کی مثبت موجودگی ہے کہ جس سے زندگی کا ہر گوشہ صد خاور بداماں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی خارج سے مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کا فوارہ اعماقِ قلوب سے پھوٹتا ہے۔ یہ اس وقت تک مثبت کیفیت نہیں بنتی جب تک کہ ''ما بانفسہم'' کے تغیر و تبدل کی آئینہ دار نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں صلاحیت کے بغیر مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ اسی لئے خدا کا یہ بخشیدہ بہشت ''ہیچ'' معلوم ہوتا ہے۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد' ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

(اقبالؒ)

اور یہ ہیچ ہی معلوم ہوتا رہے گا جب تک یہ موہبتِ الٰہی اس مقصد کے لئے استعمال نہ ہو جس کے لئے یہ عطا ہوئی ہے۔ اس کا ایسا استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارا پیش نہاد کیا ہے اور وہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ فریضہ صاحبِ فکر کا ہے اور ہماری بدبختی یہ ہے کہ:

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

ہماری سابقہ سیاست: ہندی سیاست کا 1920ء تک کا عشرہ ہمہ گیر رقص اور پیچ و تاب کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک عام ہیجان و طوفان تو ضرور تھا لیکن اعمال باطل ہو رہے تھے اور ان کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ قوم ایسا تخم بو رہی تھی جس کا کچھ حاصل نہ تھا۔ وہ اس راہ پر چل رہی تھی جس کی کوئی منزل نہ تھی۔

''شاعر کا تصور: عین اس حال میں ایک صاحبِ فکر نے قوم کو ایک تصور دیا۔ وہ تصور شاعر کا خواب اور مجذوب کی

بڑ معلوم دیتا تھا لیکن اس میں جادو تھا۔ اس نے قوم کو قوم بنا دیا۔ بکھرے دانوں کو ایک تسبیح میں پرو دیا۔ دس کروڑ کے ہجوم کو ملتِ واحدہ بنا کر ایک جھنڈے' ایک پلیٹ فارم اور ایک لیڈر سے وابستہ کر دیا۔ انتشار میں مرکزیت پیدا ہوگئی۔ باطل اعمال نتیجہ خیز ہونے شروع ہو گئے اور ائتلاف کی وہ نعمت میسر آنے لگی جو' قرآن کے الفاظ میں' دنیا بھر کے خزانوں کے عوض بھی میسر نہ آ سکتی تھی۔

و الف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم و لٰکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم (8/63)۔

اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم ائتلاف پیدا کر دیا۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین پر ہے جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا۔ لیکن یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے۔

ائتلاف' وحدتِ مقصد و وحدتِ منزل سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مقصد و منزل متعین ہو گئے تو قوم کی ہر حرکت اس متعین منزل کی جانب ہوگئی۔ ملت نے بالآخر اس منزل کو پا لیا۔ لیکن پس چہ؟ وہ منزل' بالذات نہیں بلکہ ایک خوب تر منزل کا سنگِ میل ہے۔

ہندو اور مسلمان میں فرق: تقسیم ہند سے ایک طرف ہندو نے آزادی حاصل کر لی ہے اور دوسری طرف مسلمان نے ایک قطعۂ ارض حاصل کر لیا ہے۔ ہندو کے نزدیک تصورِ آزادی محض یہ تھا کہ بدیشی راج باقی نہ رہے اور کاروبارِ حکومت دیسیوں' ملکیوں (ہندوؤں) کے ہاتھ میں آ جائے۔ یہ اس کی منزلِ مقصود تھی۔ اب جب وہ یہاں تک پہنچ گیا ہے تو وہ مطمئن ہے کہ وہ آزاد ہو گیا۔ لیکن مسلمان کی حالت مختلف ہے۔ یہ اس موجودہ آزادی کو منزل نہیں متصور کرتا۔ اس کے نزدیک یہ آزادی نشانِ منزل ہے۔ لیکن اب وہ کشمکش میں مبتلا ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مِرے پیچھے ہے کلیسا مِرے آگے

ایک کشمکش: اس کے تحت الشعور میں ایک خلش ہے' پیہم خلش' جس کا علاج اسے میسر نہیں۔ وہ دنیاوی (سیکولر) حکومت قائم کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ پاکستان کو اس نے نظامِ قرآن رائج کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اگر نظامِ قرآن رائج کرنے کی طرف آتا ہے تو اسے معلوم نہیں کہ اسے کیا کرنا ہے' اور کیسے کرنا ہے۔ قوم ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔ نظامِ قرآن کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو رہا ہے۔ ماضی کے مخصوص

حالات نے ملا کو مذہب کا خصوصی اجارہ دار بنا دیا ہے۔ ملا اسلام وقرآن کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ رجعت پسندانہ' دقیانوسی' اور ناقابلِ قبول و ناممکن العمل ہے۔ اس کے اپنے مقاصد ہیں جن کا وہ تحفظ چاہتا ہے۔ زکوٰۃ' خیرات کی مدات اس کی تحویل میں دے دی جائیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا کہ مذہب کی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن یہ ''مذہب'' چند رسوم کا نام ہے غیر مذہبی امور کے لئے ''دنیاوی حکومت'' لازمی ہے۔ دنیاوی حکومت کی زمام مغرب زدہ ہاتھوں میں ہے۔ ان کا مغربی تصورِ اجتماعیت وحکومت' مسلمانوں کے مزاجِ قومی کے مطابق نہیں۔ اربابِ حکومت مغربی فضا کے تربیت یافتہ ہونے کی حیثیت سے معذور ہیں۔ وہ صرف مغرب کا نظام ہی رائج کر سکتے ہیں۔ عوام کا تقاضا اور ان کی کیفیت جداگانہ ہے۔ مسلم لیگ نے اپنی دس سال کی سیاسی جدوجہد میں ان کی تحت الشعوری خلش کو ابھارا کہ پاکستان نفاذ نظام اسلامی کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے۔ اگر عوام کو ان خطوط پر نہ تیار کیا جاتا' یا ان کی اس خلش کو یوں برانگیخت نہ کیا جاتا تو آج ان کا مطالبہ شاید کچھ اور ہوتا۔ مسلم لیگ نے دانستہ ان کو اس طرح ابھارا اور اب کیفیت یہ ہے کہ وہ غیر مطمئن ہیں۔ قیام پاکستان سے صرف وہی طبقات و افراد مطمئن ہو سکے ہیں جن کے قلب میں کوئی خلش نہیں تھی۔ جن کے پیش نظر ذاتی مناصب وشخصی منافع تھے اور وہ ان کے حصول میں مصروف ہیں۔ جہاں تک ارباب حکومت کے مغرب زدہ تصور سیاست کا تعلق ہے' پاکستان کا مل جانا اطمینان بخش ہے۔ وہ خود تو مطمئن ہیں لیکن جو مطمئن نہیں انہیں وہ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ دیوانے۔۔ باغی۔۔ پاکستان کے خلاف ہیں۔

صاحبِ فکر: عوام غیر مطمئن ہیں کیونکہ ان کی جس خلش کو برسوں ابھارا جاتا رہا اس کی تسکین کا اب کوئی سامان نہیں۔ حتیٰ کہ روٹی کا مسئلہ جو غریب کے سامنے سب سے پہلے آتا ہے' پاکستان میں اس کا بھی اطمینان بخش حل نہیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ اس ضمن میں جو حل پیش کرتے ہیں حکومت انہیں شک کی نگاہوں سے دیکھتی ہے (اور دیکھنا بھی چاہئے) لیکن عوام کی اس مصیبت کا کوئی عملی حل خود پیش نہیں کرتی۔ کرتی فقط اتنا ہے کہ عوام کو ان کمیونسٹ وغیرہ سے دور رکھنے کے لئے اسلامی کمیونزم وغیرہ قسم کی مغالطہ انگیز اصطلاحات سے کام لیتی ہے۔ اس روش نے اوپر کے طبقہ کو منافق بنا دیا ہے۔ منافقت پھر عدم اطمینان کا باعث ہے۔ اطمینان اسلام میں ہے' منافقت میں نہیں (منافقین کے لئے جہنم میں بھی درک اسفل ہے) پھر دیکھئے کہ قوم کی حالت کیا ہے؟ ملا کے مقاصد رجعت پسندانہ اور خود غرضانہ ہیں۔ اربابِ اقتدار کی روش منافقانہ ہے۔ عوام کے تحت الشعور میں جو

خلش ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی روٹی کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ وہ غیر مطمئن ہیں۔ جنوں زدہ طبقہ میں بغاوت کے آثار ہویدا ہیں۔ ایسے میں کیا ہوگا؟ اس عدم اطمینان اور منافقت کے طبقاتی گرداب سے قوم بچ سکتی ہے تو کسی صاحبِ فکر کے صدقہ میں بچ سکتی ہے۔ مسلمانوں کا صاحبِ فکر، اقوامِ دیگر کے اصحابِ فکر سے مختلف اور نرالا ہوتا ہے۔ یہ صاحبِ فکر ہی نہیں ہوتا صاحب جنوں بھی ہوتا ہے۔ اس میں عشق و عقل نظر اور خبر کا امتزاج ہوتا ہے۔ وہ تنہا عقل نہیں ہوتا کہ مصلحت کوشیوں پر نگاہ رکھے اور جرأت رندانہ سے محروم ہو، نہ وہ محض جنوں ہوتا ہے کہ اسے پاسِ گریباں بھی نہ ہو۔ وہ اس کی تفسیر ہوتا ہے کہ

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
درجنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ مستقبل اس کے ہاتھ میں ہے جس کا سینہ کشمکش کی آماجگاہ ہے کیونکہ

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

ایسا صاحبِ فکر کہ اس کے سینہ میں قرآن کی تڑپ ہو۔۔ اس کے فکر کی روشنی میں قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا نظام متعین ہوسکتا ہے جس میں ہر ایک کو صحیح اطمینان حاصل ہو جائے اور ملت اس نورِ ربانی کی روشنی میں اپنی منزل صحیحہ کی جانب گامزن ہو سکے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ حقیقی آزادی میسر آئے گی۔ جس کے بغیر ہماری موجودہ آزادی ایک بادہ ہے بے کیف، ایک جسد ہے بے روح۔ اس کے بغیر ہم آئینی آزادی سے تو شاید ہمکنار رہ سکیں، اس حقیقی آزادی کو کبھی پا نہیں سکیں گے جو ان بے شمار اطواق و سلاسل کو توڑتی ہے جو انسان نے از خود پہن رکھی ہیں۔ آزادی کے یوم ہر سال آئیں گے اور گزر جائیں گے۔ ہم خوشیاں بھی منائیں گے، لیکن اس استخواں خوری سے کچھ نفع نہیں ہوگا، جب تک ہم مغز تک نہیں پہنچیں گے، یومہائے آزادی کے جشن بے روح بن کر رہ جائیں گے اور بس۔

نئی غلامی: اس حقیقی آزادی کے حاصل نہ ہونے سے پاکستان کے قیام نے ہم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی اور ہم بدستور وہیں ہیں جہاں قیامِ پاکستان سے پیشتر تھے۔ ہم اگر بدستور فروعات میں الجھے رہے اور ظواہر و رسوم کے غلام بنے رہے تو جو کچھ ہونے والا ہے اس کا عکس ابھی سے دیکھ لیجئے۔ ملا اور اربابِ حکومت میں سمجھوتہ ہونے کے امکانات قوی ہیں۔ ایسا ہو گیا تو ہماری ساری جدوجہد اکارت جائے گی اور تاریخ نئے اوراق الٹنے کے بجائے پرانے اوراق الٹے گی۔ ہم غیروں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنوں کے غلام ہو چکے ہوں گے۔۔ پاکستان باقی مسلمان سلطنتوں کی طرح ایک سلطنت بن جائے گی، فرق صرف یہ ہوگا۔ ''تخت و مصلیٰ'' کا یہ سمجھوتہ

مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عظیم حادثہ ہوگا۔ ایسا حادثہ جس سے جانبر ہونا صدیوں کی بات ہو جائے گی۔

عزمِ محکم: لہٰذا' آیئے! یوم آزادی منانا ہے تو عہد کیجئے کہ حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو کر رہیں گے۔ اس کی یہی صورت ہے کہ قرآن نے جن اطواق وسلاسل کو ایک بار توڑا تھا اور جن کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو جوڑ کر ہم نے پھر وہی زنجیریں تیار کر لی ہیں' آج پھر ان زنجیروں کو ایک جھٹکے سے توڑیں اور حیات اجتماعیہ کو اس قالب میں ڈھال لیں کہ محکومیت صرف اللہ کی جائز ہے' انسان کو انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ انسان' نہ حاکم ہے نہ محکوم۔ وہ خدائی قوانین کا نافذ کرنے والا اور آپس میں ائتلاف اور محبت سے کام لینے والا ہے۔ گویا بالفاظِ صحیح تر' ہم قرآن اور اسلام کا نظام اپنے اوپر مسلط کریں اور انسانیت کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرائیں۔ یاد رکھئے! یہ تسلط صرف قدمِ اول کا منتظر ہے۔ آیئے جرأتِ ایمان سے کام لیں اور یہ قدم اول اٹھائیں۔

لیکن اس ''زورِ جنوں'' میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ ہونے دیجئے کہ جس نظام کو ہم مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ اس سرزمین کے ٹکڑے کے بغیر کبھی مسلط نہ ہو سکے گا جو ہمیں خدا کی موہبت سے مل گیا ہے جسم کے بغیر اس عالم اسباب میں' جان کا تصور ممکن نہیں۔ اس لئے اس قطعۂ زمین کا تحفظ نہایت ضروری ہے کہ

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

اس سرزمین کی بخشائش پر ہماری گردنیں اس بارگاہ صمدیت کے حضور' وفورِ تشکر و امتنان سے جھک جاتی ہیں جس نے ہم ناتوانوں کو اس عطیۂ عظمیٰ سے نوازا۔ اسی سے ہم استعانت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس سرزمین کو اس کے تخت اجلال کی جولانگاہ بنا سکیں۔

اور جب خدا کے حضور سجدۂ تشکر کا ذکر آیا ہے' تو بعید از سپاس گزاری ہوگا اگر ہم قوم کے اس ''مخلص وکیل'' کا شکریہ ادا نہ کریں جس نے اپنی فراست و دیانت سے اتنا عرصہ بلا مزد و معاوضہ قوم کا مقدمہ لڑا' اور اسے اس سرزمین کا قبالہ لے دیا۔ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس محسنِ ملت کی زیرِ بارِ احسان رہیں گی۔ لیکن پاکستان کا استحکام اس ''قبالہ'' حاصل کر لینے سے نہیں ہوگا۔ یہ مشروط ہوگا ہماری اپنی صلاحیتوں پر۔ اور یہ صلاحیتیں ''ایمان و اعمال صالحہ'' کے بغیر ناممکن ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق وعبر

تاریخ سے سبق

''مشہور سیاح یاقوت حموی نے 'رے' کی تباہی کی داستان لکھتے ہوئے بتلایا ہے کہ میں 'رے' کے ویرانے سے ۶۱۷ھ میں گزرا تو دیکھا کہ اس کے کھنڈروں کی دیواریں کھڑی ہیں' اس کے منبر باقی ہیں اور چونکہ یہ شہر جلد ہی ویران ہوا تھا' اس لئے اس کی دیواروں کے نقش ونگار بھی علیٰ حالہٖ قائم ہیں۔ میں نے وہاں کے ایک سمجھدار آدمی سے اس ویرانی کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا سبب تو معمولی ہے مگر خدا جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو پورا کر ہی دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شہر میں تین گروہ تھے۔ ایک تو شافعیہ جن کی تعداد بہت کم تھی۔ دوسرے حنفیہ جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور تیسرے شیعہ جن کی تعداد سب سے زیادہ تھی اہل شہر میں سے نصف شیعہ تھے اور دیہاتوں میں شیعہ زیادہ تھے۔ ان کے بعد حنفی' پہلے سنی اور شیعوں میں تعصب پیدا ہوا۔ اور حنفیوں اور شافعیوں نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا اور طویل لڑائیوں کے بعد ان کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ اس کے بعد حنفیوں اور شافعیوں میں کشمکش پیدا ہوئی۔ دونوں کے مابین لڑائیاں ہوئیں۔ دیہات کے حنفی شہر میں ہتھیار لے کر آتے اور شہری احناف کی مدد کرتے تھے' مگر شافعیوں نے حنفیوں کا خاتمہ کر دیا۔ شہر کے یہ سب ویران محلے جو تم دیکھ رہے ہو اِنہیں حنفیوں اور شافعیوں کے محلے ہیں۔ اب صرف ایک محلّہ شافعیوں کا رہ گیا ہے۔ جو 'رے' کا سب سے چھوٹا محلّہ ہے۔''

یہ صرف تاریخ کا ایک واقعہ ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو اس قسم کے متعدد واقعات ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ جن میں مسلمانوں کے فرقوں کے باہمی تعصب اور عداوت نے سلطنتوں کو تباہ اور مملکتوں کو برباد کر دیا۔ سب سے بڑی تباہی عباسی سلطنت کی تصور کی جاتی ہے۔ وہ خود ایک شیعہ وزیر کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ جس

نے اس غرض کے لئے ہلاکو خاں کو بلا منگایا تھا۔ مسلمانوں کے فرقوں کی باہمی عداوت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ فرقوں کا وجود ہی دوسروں سے نفرت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لئے فرقوں کی موجودگی میں تمام مسلمانوں کا امت واحدہ بن جانا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ توحید کا عملی مظاہرہ ملت کی وحدت ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ مملکت پاکستان میں اس قسم کا دستور نافذ ہو جائے گا۔ جس سے آہستہ آہستہ فرقہ بندی کی لعنت ختم ہو جائے گی اور اس کے لئے ہم مسلسل کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن یہاں رجعت پسند عناصر جس تیزی اور شدت سے ابھر رہے ہیں اور سیاسی مفاد پرستوں نے جس مذہب کو اپنی سپر بنا رکھا ہے اس کے پیش نظر ہمیں خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ملک بھی مذہبی فرقوں کی کشمکش کی آماجگاہ بن کر رہے گا اور ان ہی کے ہاتھوں (خاکم بدہن) یہ مملکت بھی تباہ ہو جائے گی۔ اس وقت تو یہ فرقے مذہب کے نام پر حصول اقتدار کی کوششوں میں متحد نظر آتے ہیں۔ لیکن جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ تو پھر دیکھئے گا کہ یہ کس طرح آپس میں دست بہ گریباں ہوتے ہیں۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے۔

ہماری کس قدر بدقسمتی ہے کہ ہم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کی روک تھام کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ فرقہ پرستی کے خلاف طلوع اسلام کی تنہا آواز ہے جو مخالفتوں کے اتنے ہجوم کا مقابلہ کر رہی ہے اور اسے دبانے کے لئے بھی ہر ممکن کوشش جاری ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

اتحادِ امت: ایک مخلصانہ تجویز

مندرجہ ذیل احکاماتِ الٰہی کی موجودگی میں امتِ مسلمہ کے اندر کسی قسم کے فرقوں کی ہرگز ہرگز کوئی گنجائش نہیں۔

(۱) واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا (۳/۱۰۳)۔

اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔

(۲) ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعدما جاء ھم البینٰت واولـئک لھم عذاب عظیم o (۳/۱۰۴)۔

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیل آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا، انہیں لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔

(۳) ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شئ انما امرھم الی اللہ ثم ینبئھم بما کانوا یفعلون o (۶/۱۵۹)۔

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں بس ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے۔

(۴) فتقطعوا امرھم بینھم زبرا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۲۳/۵۳)۔

پھر انہوں نے خود (ہی) اپنے امر (دین) کے آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لئے، ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسی پر اترا رہا ہے۔

(۵) من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۲)۔

ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی گروہ گروہ ہو گئے۔ ہر گروہ

اس چیز پر جو اس کے پاس ہے مگن ہے۔

(۶) وما اختلفتم فیه من شئ فحکمه الی الله (۴۲/۱۰)۔

اور جس جس چیز میں تمہارا اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔

(۷) وما تفرقوا لا من بعد ما جاء هم العلم بغیاً بینهم (۴۲/۱۴)۔

ان لوگوں نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد ہی اختلاف کیا (اور وہ بھی) اپنی ضد بحث سے۔

اس وقت مسلمانوں میں دو بڑے فرقے یعنی شیعہ اور سنی عملاً موجود ہیں جن کے جواز کے لئے عموماً درج ذیل احادیث پیش کی جاتی ہیں:

(i) عن جابر قال رائیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فی حجته یوم عرفة وهو علی ناقته القصواء یخطب فسمعته یقال یاایها الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم به لن تضلوا کتاب الله و عترتی اهل بیتی۔ (رواہ الترمذی)۔

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع میں عرفے کے روز رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ اونٹنی قصویٰ پر سوار ہو کر خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے سنا آپ یہ فرما رہے تھے۔ اے لوگو میں نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اسے مضبوط تھامے رکھو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور وہ خدا کی کتاب ہے اور میرے اہلبیت میں سے میری عزت (یعنی جدی اولاد)۔ (ترمذی)۔

(ii) وعن زید بن ارقم قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انی تارك فیکم ما ان تمسکتم به لن تضلوا بعدی احدهما اعظم من الاٰخر کتاب الله حبل ممدود من السماء الی الارض وعترتی اهل بیتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض فانظر وا کیف تخلفونی فیهما۔ (رواہ الترمذی)۔

حضرت زید بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑتا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوط پکڑے رہو اور اس پر عامل رہو تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے (اور یہ دو چیزیں ہیں) جن میں سے ایک دوسرے سے بڑی ہے یعنی خدا کی کتاب ایک رسی کی مانند ہے جو آسمان سے زمین تک آئی ہوئی ہے۔ اور دوسری میری عزت ہے۔ میرے اہل بیت میں سے اور خدا کی کتاب اور

میری عزت قیامت کے دن ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ حوض پر آئیں گے۔ اب تم دیکھو گے کہ میرے بعد تم دونوں چیزوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔

(iii) یاایھا الناس انی قدترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہٖ فلن تضلوا ابدا: کتاب اللہ و سنۃ نبیہٖ ان کل مسلم اخ المسلم۔ المسلمون اخوۃ۔ (مستدرک حاکم ۱/۹۳)۔

اے لوگو بے شک میں تم میں وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے تو گمراہ نہیں ہو گے وہ ہے اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔ بے شک ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(iv) وعن مالک ابن انس مرسلا قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترکت فیکم امرین لن تضلوا ماتمسکتم بھما کتاب اللہ و سنۃ رسولہٖ۔ (رواہ الموطا)

حضرت مالک ابن انسؓ بطریق مرسل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم انہیں مضبوط پکڑے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔

ناصرف ان چاروں احادیث کے اسناد میں بالترتیب زید بن الحسن، اعمش و حبیب بن ابی ثابت، اسماعیل بن ابی اویس اور اسماعیل بن ابی اویس ضعیف راوی موجود ہیں بلکہ یہ احادیث مذکورہ بالا احکاماتِ الٰہی سے بھی متصادم ہیں لہٰذا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نہیں ہو سکتیں۔

البتہ مندرجہ ذیل حدیث ہر لحاظ سے صحیح ہے:

وقد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم کتاب اللہ۔ (صحیح مسلم باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ۱/ ۳۹۷)۔

تمہارے درمیان چھوڑے جاتا ہوں میں ایسی چیز کہ اگر تم اسے مضبوط پکڑے رہو تو اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔

کیونکہ ناصرف اس کے سب راوی ثقہ ہیں بلکہ یہ درجِ ذیل آیت مبارکہ کے بھی عین مطابق ہے:

یاایھا الرسول بلغ ماانزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسلتہ واللہ یعصمک من الناس ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ (۵/ ۶۷)۔

(اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی اور آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچا لے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔)

مزید برآں اس حدیث کی مندرجہ ذیل صحیح احادیث پوری تائید کرتی ہیں:

(۱) بلغوا عنی ولو آیة (بخاری۔ کتاب الانبیاء، ترمذی۔ کتاب العلم، مسند احمد۔ دوسری جلد صفحہ ۱۵۹، ۲۰۲، ۲۱۴ دارمی۔ مقدمہ)۔

(میری جانب سے لوگوں تک پہنچاؤ خواہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو)۔

(۲) لا تکتبوا عنی غیر القران ومن کتب عنی شیأ غیرہ فلیمحہ۔ (مسلم)

مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو وہ اس کو مٹا ڈالے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن مجید اور صحیح احادیث نبویؐ کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی لوگوں تک اللہ کا قرآن پہنچانا تھا۔ قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا لوگوں تک پہنچانا رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی نہیں تھا۔ اگر آپ ﷺ **بلغوا عنی ولو آیة** کی جگہ **بلغوا عنی ولو حدیثی** فرماتے تو یہ آپؐ کے فرض منصبی کے خلاف ہوتا۔ یہ آپؐ قطعاً نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ **قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم** (۶/۱۵) (آپ کہہ دیجئے کہ میں اگر اپنے رب کا کہنا نہ مانوں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں) کا اعلان ہر وقت آپ ﷺ کے پیشِ نظر تھا۔ لہٰذا آپؐ نے مسلمین کو بھی صرف اور صرف قرآن کو مضبوطی سے تھام رکھنے اور لوگوں تک پہنچانے کی تلقین فرمائی۔

اس لئے ہر مسلم کو عقل و بصیرت سے قرآن سیکھنے سکھانے، سمجھنے سمجھانے اور قرآنی نظام کے قیام کے لئے اپنی توانائیوں اور وسائل کو صرف کرنا چاہئے۔ آیتِ مبارکہ **وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القران مھجورا** (۲۵/۳۰)۔ (اور رسول کہے گا کہ اے میرے پروردگار! بے شک میری امت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا) کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے **ان صلوٰتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین** (۶/۱۶۲) (بے شک میری صلوٰۃ، میرے نُسک، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے) کے اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہئے۔ سب مسلمین آپس میں

بھائی بھائی ہیں۔ ان میں کسی قسم کی فرقہ بازی، مسلک سازی، گروہ بندی، ذات برادری، عربی، عجمی، گورے کالے، لسانی اور علاقائی بنیاد پر تقسیم ہرگز جائز نہیں بلکہ شرک ہے۔ کسی مسلم کے نام کے ساتھ ایسے کسی سابقے لاحقے کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ مساجد میں بھی شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث وغیرہ کا امتیاز قطعاً نہیں ہونا چاہئے۔ کسی مسجد کی رجسٹریشن کسی فرقہ یا مسلک کے لحاظ سے نہیں ہونی چاہئے۔ مسجد کی تعمیر و رجسٹریشن صرف بطور مسجد (یعنی مسلمین کی مسجد) ہونی چاہئے۔ قرآنِ حکیم کے مطابق ایک عالم کے لئے عقل و بصیرت سے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ صحیفۂ فطرت کا ماہر ہونا یعنی جدید سائنسی علوم کا ماہر یا سائنسدان ہونا بھی لازمی ہے۔ اس لئے ہر مسلم کو عقل و بصیرت سے قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ جدید ترین سائنسی علوم حاصل کرنے کے سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک یکساں مواقع مہیا کئے جانے چاہئیں۔ اس مقصد کے لئے مدارس کو بھی سکولوں اور کالجوں میں تبدیل کر دینا چاہئے تاکہ امت مسلمہ دین و دنیا دونوں میں سرفراز ہو سکے اور فرقہ واریت سے بھی چھٹکارا حاصل کر سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریک طلوع اسلام کا تعارف

﴿بانئ تحریک کے الفاظ میں﴾

تقسیم سے قبل گو طلوع اسلام کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوع اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام' ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا' وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کرسکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جاسکتا۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لے کر حصولِ پاکستان کے بعد طلوع اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصول مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اس کے نمایاں خط و خال امت کو دکھائے اور قرآن ہی کی روشنی میں اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔ طلوع اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب' سعید روحیں اور جو قرآنِ کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف و جوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پر جمع کرلیا جائے اور اس

طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط و خال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔ محترم پرویز صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالۂ طلوع اسلام کے ہزار ہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں نقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آپ چہار اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویز صاحب نے جو طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت میں پیش کیا ہے' یہ ہے:

(۱) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(۲) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(۳) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(۴) رسولؐ اللہ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا یہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا' جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(۶) بدقسمتی سے خلافت علی منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا' اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(۷) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے' جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان

اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(۸) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(۹) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم وفنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(۱۰) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن سے حضور ﷺ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحنِ چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(۱۱) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے، احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(۱۳) قرآنی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی

ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آئند ہوسکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط وخال جنہیں طلوع اسلام..... نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھاتا رہا اور یہی تھی آہن کی وہ فسان جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو گئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہیئت کا نام ''بزم طلوع اسلام'' ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل و بصیرت کی رو سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے ور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جا رہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوع اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام و عمل کی پیامبر ہے ان حالات میں ایک

طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ' دین خطرہ میں ہے۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابیٔ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہئے۔ سوشل ورک کر کے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کر کے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہئے۔

اندریں حالات' ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد' نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دیں۔

دستور اساسی و اصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے:۔۔

''بزمِ طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ' یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں' انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔''

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ ۱۹۵۶ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دور حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں' میں اس نتیجہ

پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں.....

قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت' ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے' بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے' سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا' ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہوسکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے' انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظّم کوشش (Organised Effort) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پارٹی بازی اور منظّم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحزب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۲)۔ پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (Loyal) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اسکی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس

کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزاء کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل وتحقیر ہوتا ہے، جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں..... یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظّم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے، وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظّم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں، ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں، ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی، خدا کی صفتِ رب العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمہ زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از پیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں''۔

ایک دوسرے مقام پر پرویز صاحب نے فرمایا:

''قرآنِ کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں، اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا''۔

ایک اور مقام پر موصوف نے کہا:

''حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے' انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رو سے احترام انسانیت' انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ یہ تبدیلی یقین (Conviction) سے آتی ہے اور (Conviction) کی بنیاد دلائل و براہین کی رُو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں''۔

''دنیا میں ساری قوتوں کا راز' ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔ شکست و کامرانی کا بنیادی مدار ساز و سامان پر نہیں' یقین اور عدمِ یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب و شاد کام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہو اللہ واحد القہار پر تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلا سکتی''۔

''(نظام خداوندی) کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔شعور کی یہ بیداری اور فکر و نظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کے عام کرنے میں اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگۂ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔ اسی کا نام تعلیم کتاب و حکمت ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے اسی نقطۂ سے آغاز کار کیا تھا.....اس تصور کو عام کرنے سے ایسے' سعادت مند افراد نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت ہوتی ہے۔ اسی کا نام نفس کی بالیدگی ہے اور تعلیم و حکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے''۔

تعلیم و حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے لکھا:

''تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔ کسی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی

سمجھ میں آ جائے' تعلیم ہے۔ تعلیم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہوسکتی ہے قلبی ایقان نہیں۔ دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں ہوتی' اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے' جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیرِ فکر پر نہیں وہ نظام کبھی نشوو ارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔ بہترین دساتیر و قوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب و نگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔ عمل کا محرک جذبہ' قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کا تعلق دل سے ہے' دماغ سے نہیں۔ اس لئے تنہا علم عمل کا محرک نہیں ہوسکتا۔ قرآن اس قسم کی سوسائٹی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی ذات کی تسکین محسوس کرے۔ قلب کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔ جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلابِ عظیم آ جاتا ہے۔ قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے''۔

(موصوف نے کہا)۔ ''قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ' عقل اور عشق' جنون اور خرد' ذکر اور فکر' خبر اور نظر' دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں' وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ ''جنون اور خرد'' جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔۔۔ اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج جس میں نہ تو جنون مذہبی دیوانگی سکھا دے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے' قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ ''خرد و جنون'' جنہیں وہ اولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعودا و علیٰ جنوبھم ویفکرون فی خلق السمٰوٰت و الارض۔ (3/190) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ اربابِ عقل و بصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی

راہنمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں' یہی ہیں وہ مکمل عدل کا ''خواب'' دیکھنے والے جو اس ''خواب'' کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہوں''۔

طلوع اسلام کی دوسری سالانہ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا:

''جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع و شریٰ کا معاملہ کرتی ہے اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے۔ کس قدر روپیہ فراہم کیا۔ کتنے جلسے کئے' کتنے جلوس نکالے' مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں' وہ اپنی ذات' اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو' قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں''۔

طلوع اسلام کی ساتویں کنونشن میں موصوف نے کہا:

''انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے' قدیم تصوراتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے' ملوکیت' سرمایہ داری' مذہب' سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں..... اس وقت لا کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد' ان کے مقام سے ہٹانے' یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے''۔

طلوع اسلام کی نویں کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا:

''یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا' مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ جو شخص لوگوں کے سامنے ان کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے' پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے' اسے ان کا مسلمہ لیڈر' راہنمائے شریعت یا مرشد طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص ان کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے' انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے' وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا' اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اسکا قائد بن جانا' میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر' قرآن کی آواز پر لبیک کہوں' اور اس طرح دنیا جہان کی مخالفت مول لے لوں' میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے' سوچتے سمجھتے کیا اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُر خار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخِ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔[1] مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے' مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

[1] جو نظامِ حیات خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا ہے اسے دین کہا جاتا ہے۔ جب اس میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتی ہے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔ ہمارا مروجہ اسلام بھی مذہب بن چکا ہے۔

یہ تو دین کا خاصا ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسے کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں' اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہ رہے' تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق' ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا' اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہو جانے کے بعد' اگر اس قوم کے سامنے دین نہ ہو' تو وہ دہریت اختیار کر لیتی ہے' اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست' مستقل اقدار سے الگ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصا یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی' اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آ جائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو' تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہِ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے' وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رخ کرے' یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے''۔

طلوع اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں پرویزؔ صاحب نے اراکین بزمہائے طلوع اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں نے زمیلانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اس روشنی کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد' نہایت سکون و خامشی' لیکن انتہائی التزام و استحکام کے ساتھ' قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری کا کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستور اساسی کی ایک شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیں گے اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفاد عاجلہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس

میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون و اطمینان سے برداشت کرنا' اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے' اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل کر مر جانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے' دوسری طرف مفاد عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گزر جانا ہے کہ اس کی کوئی کشش و جاذبیت آپ کی دامنگیر نہ ہو''۔

یہ ہیں قرآنی حقائق پر استوار اس تنظیم کے مقاصد' اور یہ ہے وہ مخصوص اور متعین طریقِ کار (ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب) جسے اس تحریک نے اپنے روزِ اول سے اختیار کر رکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ اس قسم کی تحریک آپ کے تعاون کی مستحق ہے یا نہیں۔

والسلام!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

مفسرینِ کرام کی ایک لغزش کے انسانیت سوز نتائج

پاکستان اور بیرون پاکستان، آج کل مختاراں مائی کے کیس کی بہت شہرت ہو رہی ہے اور اردو، انگریزی، پریس میں اس کا عام چرچا ہے۔ اہم انگریزی اخبارات میں اس بارے میں اداریئے شائع ہو رہے ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ امریکہ میں House of Representative میں مورخہ 10 مارچ کو California کی نمائندہ قانون Woolsey نے ہاؤس کو اس کیس کی پوری تفصیلات سنائیں اور اپنی حکومت سے درخواست کی کہ وہ پاکستان میں خواتین کی تعلیم پر زیادہ رقم صرف کرے تاکہ خواتین میں عام بیداری پیدا ہو اور اس طرح اس قسم کے جرائم کا انسداد ہو، ہمارے ہاں پاکستان میں بھی حدود آرڈیننس کی وجہ سے کئی ہزار عورتیں بغیر کسی قصور کے اس وقت جیلوں میں زندگی گزار رہی ہیں کیونکہ وہ عدالتی کاروائی کے دوران چار گواہ حاضر کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اس لئے وہ خود ہی قذف کے الزام میں قید کر دی جاتی ہیں۔ یہ خواتین کے خلاف بڑا ہی افسوسناک اور پر درد سلوک ہے، جس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

موقر ماہنامہ رسالہ ''طلوع اسلام'' کو وقتی حادثات و واقعات، یا سیاسی و قانونی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ایک علمی و فکری تحریک ہے۔ البتہ اگر کسی قانون یا واقعہ کی بنیاد یا وجہ قرآن کریم کی غلط توجیہہ و تفسیر ہو، جس سے خلافِ قرآن نظریات کی اشاعت ہو رہی ہو، تو طلوع اسلام اس کا فوری نوٹس لینا ضروری سمجھتا ہے اور چونکہ طلوع اسلام قرآن کریم کا داعی ہے، اس لئے وہ اس بارے میں قرآن کریم کا صحیح موقف پیش کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ لیکن اس کو ان معاملات میں افراد یا اداروں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ زنا کے سلسلہ میں مختاراں مائی کا کیس ہو، یا ان سینکڑوں عورتوں کا معاملہ ہو، جو بے قصور جیلوں میں زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کی بنیاد صرف ہمارے مفسرین کی ایک لغزش ہے جس کی وجہ سے یہ ساری تباہی عورتوں پر آ رہی

ہے اور جس آیت کریمہ کی غلط تعبیر کی وجہ سے زنا کے کیس میں چار گواہوں کا عینی شاہد ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ عدالتی کارروائی کے لئے چونکہ چار عینی گواہ دستیاب نہیں ہو سکتے' اس لئے کیس عورتوں کے خلاف چلا جاتا ہے۔ اس مضمون میں اس آیت کریمہ کا صحیح مفہوم پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے جس کے مطالعہ کے بعد قارئین کرام خود اندازہ فرمالیں گے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

ہمارے روایتی مفسرین کا سب سے بڑا تسامح یہ ہے کہ وہ خود آیات پر غور نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ سلف سے چلا آ رہا ہے' اس کو اسی طرح منتقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر شروع کی تفاسیر میں کسی آیت کی غلط تفسیر ہوگئی تو بعد کے مفسرین اس کو بغیر غور و فکر کئے اسی طرح نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ زیر غور آیتہ کریمہ کی بھی یہی صورت حال ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے مفسرین جب بھی قرآن کے خلاف جاتے ہیں اور لغزش کھاتے ہیں' تو اس لغزش میں تمام فرقے متفق ہوتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ جب بھی مفسرین نے کسی بات پر اتفاق کیا ہے وہ ہمیشہ قرآن کے خلاف ہی ہوتی ہے۔ اس تمہید کے بعد آپ کے غور و فکر کے لئے دو آیات کریمات پیش کی جاتی ہیں جن کی بناء پر چار عینی گواہوں کا ہونا لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ آیات کریمات خود بھی واضح ہیں اور اس مضمون میں ان کو اس قدر واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر قاری خود ہی اس کو بسہولت سمجھ سکے۔ یہ سورہ نساء کی آیات ۱۵ و ۱۶ ہیں۔ پہلے ان کا ترجمہ اور دو تین مختلف تفاسیر کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے تا کہ قارئین کرام کو سابقہ مفسرین کا نظریہ بخوبی معلوم ہو سکے۔ پھر آیات کا صحیح مفہوم اور سابقہ مفسرین کرام کی لغزش کی نشاندہی کی جائے گی۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاللہ ہوتا ہے:

والٰتی یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیهن اربعة منکم فان شهدوا فامسکوهن فی البیوت حتٰی یتوفٰهن الموت او یجعل الله لهن سبیلا o والذٰن یاتیٰنها منکم فاٰذوهما فان تابا و اصلحا فاعرضوا عنهما ان الله کان توابا رحیماo (۱۵'۱۶/۴)۔

(ترجمہ) اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدکاری کریں تو ان کی بدکاری پر اپنے لوگوں میں سے چار کی گواہی لو۔ پھر اگر چاروں گواہ اس کی تصدیق کریں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا خدا ان کی کوئی (دوسری)

راہ نکالے۔ اور تم لوگوں میں جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہو ان کو مارو پیٹو' پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان کو چھوڑ دو بے شک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دیوبندی رقمطراز ہیں:

''اگر کسی کی زوجہ کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو تو اس کے لئے چار گواہ مسلمانوں میں سے عاقل بالغ آراء قائم ہونے چاہئیں۔ اگر چار آدمی گواہی دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہئے۔ گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا انتظاماً بالکل روک دیا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مر جائے یا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی حکم یا سزا مقرر فرمائے۔ اس وقت تک زانیہ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ اس کا وعدہ کیا چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد سورۂ نور میں اس کی حد نازل فرما دی کہ باکرہ کے لئے سو کوڑے اور ثیبہ (جو عورت کنواری نہ ہو' خواہ اس کا شوہر زندہ ہو یا وفات پا گیا ہو) کے واسطے سنگسار کرنا ہے۔''

(۲) مشہور و معروف تفسیر فصل الخطاب میں اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں تحریر ہے کہ:

''ہر دعوے کا ثبوت دو گواہوں سے ہوتا ہے۔ مگر یہ ناموس کا معاملہ ہے اور بدچلنی کا الزام اتنا سخت ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ثابت نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس عورت کی بدچلنی اور بے باکی کی حد ہی نہیں اور وہ سماج کے لئے کیسی زہر قاتل ہے جو ایسے جرم کا ارتکاب اتنے آدمیوں کے سامنے کرے کہ چار چشم دید گواہ اور وہ بھی عادل اس کے جرم کے ثبوت میں پیش ہوسکیں۔ پھر ایسی عورت کو بداخلاقی سے روکنے یا کم سے کم سماج کو اس کے اثرات سے بچانے کے لئے اگر یہ سختی کی جائے تو کیا وہ بے محل سمجھی جا سکتی ہے۔'' (جلد دوئم' صفحہ ۱۶۵)۔

(۳) اہل حدیث حضرات کی مشہور و مستند تفسیر ''تفسیر ثنائی'' میں اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں رقم ہے:

''پس جو تمہاری عورتوں میں سے زنا کریں' ان پر اپنے لوگوں (مسلمانوں) میں سے بدکاری دیکھنے والے چار گواہ مقرر کرلو پھر اگر وہ قاضی کے سامنے گواہی دے دیں تو بالفصل ان کی یہ سزا ہے کہ ان کو اپنے گھروں میں بند رکھو بالکل کہیں بھی جانے نہ دو یہاں تک کہ مر جائیں یا اللہ ان کے لئے کوئی حکم بتلا دے جو متعلق سزا ہو جسے بھگت کر وہ چھوٹ جائیں۔ چونکہ صرف عورتوں کے رکنے سے زنا بند نہیں ہوسکتا بلکہ ایک اور ذریعہ بھی زانیوں کے لئے موجود ہے کہ

لڑکوں سے زنا کریں سو اس کی بابت بھی سنو کہ جو دو مرد تم میں سے وہی لوطیوں کا کام کریں اور زنا بالشہادت بھی ثابت ہو جائے تو ان کو تکلیف پہنچاؤ اور زبانی بھی لعن طعن کرو کہ تم نے بہت بے جا کیا جس سے تمہارے اعتبار اور نیک بختی میں فرق آ گیا ہے۔ جب ہر طرف سے ان کو برا سننا ہوگا تو خود ہی اس فعل شنیع سے باز آ جائیں گے۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنے اعمال کو درست کریں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو خدا بھی ان کو معاف کرے گا اس لئے کہ خدا توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔'' (جلد اول' صفحہ ۲۸۸)۔

(۴) ملت جعفریہ ''خیر البریہ'' کی مشہور تفسیر رقم کردہ حضرت العلماء' ادیب اعظم جناب مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی میں تحریر ہے:

''بدکار عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا کہ انہیں کہیں نہ نکلنے دو یہاں تک کہ وہ مر جائیں۔ لیکن کچھ دن بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ حکم نازل ہوا کہ اگر کوئی بے شوہر والی عورت زنا کرائے تو عورت و مرد دونوں کو سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر شوہر دار عورت زنا کرائے تو سنگسار کی جائے۔''

(۵) تفسیر شہیر ''تدبر قرآن'' میں مرقوم ہے:

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کر دو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کرے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکالے اور جو دونوں تم میں سے بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذاء پہنچاؤ بس اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو' بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔''

آپ نے مختلف فرقوں کی پانچ مستند تفاسیر کے اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ سب نے اس آیت کریمہ میں فاحشہ سے مراد زنا لیا ہے اور اس کے لئے چار عادل گواہ شرط قرار دیئے ہیں۔ اسی آیۂ کریمہ کو بنیاد بنا کر ہماری فقہ میں بھی یہی قانون بنایا گیا ہے اور اسی آیت کو اساس قرار دے کر' حدود آرڈیننس میں بھی سزا کے لئے چار گواہوں کی گواہی شرط رکھی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیۂ کریمہ کا ارتکابِ زنا سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے فقہ کا قانون ہی غلط ہے۔ اس آیت کریمہ کو زنا کی سزا اور چار گواہوں کی شرط کی بنیاد بنانا غلط ہے' اس آیت کا کوئی تعلق زنا کے فعل سے نہیں ہے' اس

کے لئے مندرجہ ذیل نکات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کسی بھی ایک جرم کی ایک ہی سزا ہوسکتی ہے۔ ایک جرم کی دو مختلف سزائیں نہیں ہوسکتیں۔ قرآن کریم نے سورۂ نور میں زنا کی سزا سو کوڑے مقرر فرما دی ہے لیکن یہاں فاحشہ کی سزا ''پابند مسکن'' کرنا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ زنا کا جرم نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک جرم (زنا) کی دو مختلف سزائیں یعنی کہیں کوڑے اور کہیں پابند مسکن کرنا نہیں ہوسکتیں۔ بعض مفسرین نے اس آیت کو سورہ نور کی آیت سے منسوخ قرار دیا ہے۔ لیکن نسخ کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ اس کے لئے رسالہ طلوع اسلام' میں بہت مواد موجود ہے' اس میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ موضوع اس مضمون کی حدود سے باہر ہے اور اس قدر طویل ہے یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن حیرانی اس بات کی ہے کہ جو حضرات اس آیت کو سورہ نور کی آیت سے منسوخ قرار دیتے ہیں وہ صرف سزا کو منسوخ کرتے ہیں' لیکن چار گواہوں کی شرط کو منسوخ نہیں کرتے۔ چنانچہ ''تدبر قرآن'' میں مرقوم ہے ''اگرچہ یہ تعزیرات سورہ نور میں نازل شدہ حدود کے بعد منسوخ ہو گئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا''۔ (جلد۲' صفحہ۲۶۵)۔

اسی طرح تفسیر حسینی میں بھی تحریر ہے کہ ''پس بحکم ایں حدیث امساک بیوت منسوخ شد و اشہاد و استشہاد باقی ماند''۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اول تو نسخ کا عقیدہ ہی خلاف قرآن ہے لیکن یہ کون سی تُک ہے کہ آیت تو منسوخ ہوگئی لیکن اس کا ایک حصہ یعنی سزا کو تو منسوخ کر دیا اور گواہوں کی شرط کو قائم رکھا' یعنی شہادت کا ضابطہ منسوخ نہیں ہوا۔ یاللعجب۔

(۲) زنا کے ارتکاب کے لئے مرد اور عورت دونوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس آیہ کریمہ میں صرف عورتوں کا ہی ذکر ہے۔ مرد کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ یہ کیسا زنا ہے کہ جس میں مرد موجود ہی نہیں ہو۔ اس کی وضاحت صرف ہمارے علماء کرام ہی فرما سکتے ہیں۔ حالانکہ اس سے بخوبی واضح ہے کہ یہ فعل زنا کا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ بغیر مرد کے زنا کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔

(۳) او یجعل اللہ لھن سبیلا سے جو یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ یہ وہ وعدہ ہے کہ جس وعدہ کے مطابق سورہ نور میں زنا کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ تو یہ بات بھی درست نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ سزا کا ذکر نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر سزا کا ذکر ہوتا تو لھن کی جگہ علیھن آنا چاہئے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سبیل بنا دے سے مراد یہ ہے کہ ان کا اعتبار قائم ہو جائے اور پھر ان کے باہر آنے جانے میں کوئی حرج باقی نہ رہے۔ یہی بات ان کے فائدے کی

ہے۔

(۴) اصل یہ ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے الفاحشہ کے لفظ سے لغزش کھائی ہے۔ اس آیہ کریمہ میں الفاحشہ کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے علماء کرام نے زبردستی اس کا مفہوم زنا لے لیا ہے۔ فاحشہ کے معنے صرف زنا کے نہیں ہوتے۔ ہر بے حیائی کی بات اور ہر گناہ کو فاحشہ کہتے ہیں۔ چنانچہ والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذكروا الله فاستغفروا لذنوبهم (۳/۱۳۵)۔ (ترجمہ) وہ لوگ کہ جب ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے یا وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد رکھ لیتے ہیں اور اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔ فاشتہ کے معنے یہاں زنا کے نہیں ہیں بلکہ محض گناہ کے ہیں جس کی تفسیر خود ذنوبھم کے لفظ سے کر دی گئی ہے' اسی طرح آیت نمبر ۸۰/ ۷ اور ۵۴/ ۲۷ میں یہ لفظ لواطت کے لئے آیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

انكم لتاتون الرجال شهوة من دون النساء بل انتهم قوم مسرفون (۸۰/ ۷)۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت پرستی میں مردوں کی طرف مائل ہوتے ہو' مگر تم لوگ (نطفہ کو) سرف کرنے والے ہو۔

اس آیت کریمہ کے الفاظ من دون النساء نے خود وضاحت کر دی کہ یہاں اس کے معنے لواطت (Homosexuality) کے ہیں' زنا کے ہو ہی نہیں سکتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے فتح الرحمان میں اس کا ترجمہ تحریر فرمایا ہے۔ ہر آئینہ شما میدوید بشہوت بسوی مردمان بجز زنان' بلکہ شما گروہ مسرفانند (صفحہ ۳۳۹)۔ نیز ارشاد ہوتا ہے ائنكم لتاتون الرجال شهوة من دون النساء (۵۴/ ۲۷)۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت سے مردوں کے پاس آتے ہو۔ ان دو آیات مبارکات میں فاحشہ کا ترجمہ لواطت (Homosexuality) کیا ہے۔ ان دو آیات سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ فاحشہ کا اطلاق صرف زنا پر نہیں ہوتا بلکہ فاحشہ کے معنے عام بے حیائی' اور لواطت کے بھی ہیں۔

قرآن کریم میں فواحش کا لفظ بطور جمع بھی آیا ہے جو خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشہ صرف ایک زنا ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے بے حیائی کے کام فاحشہ کے ذیل میں آ سکتے ہیں' جب ہی تو اس کی جمع فواحش استعمال کی گئی ہے۔

اگر آپ اس زیر غور آیہ کریمہ نمبر ۱۵ کو اس سے بالکل متصل اگلی آیت نمبر ۱۶ سے ملا کر ملاحظہ فرمائیں تو بات سورج کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہاں الفاحشہ

سے مراد سحاقت (Female Homosexuality) ہے کیونکہ اس متصلہ آیت نمبر ۱۶ میں لواطت (Male Homosexuality) کا بیان ہو رہا ہے اور اس کی سزا کا تذکرہ ہے۔ یہ دونوں متصلہ آیات نمبر ۱۵، ۱۶ ہم جنس پرستی کے متعلق ہیں۔ پہلی آیت ۱۵ میں سحاقت کا بیان ہے اور دوسری آیت ۱۶ میں لواطت کا بیان ہے۔ دونوں آیات کا تعلق ہم جنس پرستی سے ہے' متصلہ آیت کریمہ یہ ہے والذن یاتینھا منکم فاذو ھما فان تابا و اصلحا فاعرضوا عنھما ان اللہ کان توابا رحیما (۴/۱۶)۔ اور تم لوگوں میں سے جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہو ان کو مارو پیٹو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو ان کو چھوڑ دو بے شک خدا تواب و رحیم ہے۔ اس آیت کا یہ بامحاورہ ترجمہ نقل کیا گیا ہے لیکن شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ جو مستند ترین اور تحت اللفظ ترجمہ ہے وہ اس بارے میں بڑا معنی خیز اور فیصلہ کن ہے۔ وہ ترجمہ فرماتے ہیں۔ ''اور جو دو کرنے والے کریں تم میں وہی کام تو ان کو ستاؤ' پھر اگر توبہ کریں اور سنوار پکڑیں تو انکا خیال چھوڑ دو' اللہ توبہ قبول کرتا ہے مہربان''۔ اس آیت کریمہ میں شاہ صاحب محترم نے جو یاتینھا کا ترجمہ ''وہی کام'' فرمایا ہے اس نے بات بالکل واضح کر دی۔ کیونکہ آپ نے ھا کا مرجع الفاحشہ قرار دیا ہے۔ چونکہ اس آیت کریمہ (۱۶) میں ذکر ہم جنس پرستی کا ہو رہا ہے۔ اس لئے ''وہی کام'' کا مطلب زیرغور آیت (۱۵) میں بھی ہم جنس پرستی ہی ہوگا' زنا نہیں ہوسکتا۔ اس آیت میں بیان مردوں کی ہم جنس پرستی کا ہے اور سابقہ آیت میں عورتوں کی ہم جنس پرستی کا ہے۔ ان دونوں آیات میں کام کی نوعیت کا ایک جیسا ہونا لازمی ہے جب ہی تو ''وہی کام'' کی شرط پوری ہوگی اور وہ ایک ہی نوعیت کا کام ہم جنس پرستی ہے۔ یہ دونوں آیات لواطت و سحاقت سے متعلق ہیں' ان کا زنا سے' یا اس کی سزا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آیات کا مفہوم آپ نے خود ملاحظہ فرما لیا حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ہر قاری کو بآسانی ان آیات کا مفہوم سمجھ میں آ جائے کیونکہ آیات نہ تو کچھ پیچیدہ ہیں اور نہ ہی عربی کے قواعد اس میں Involve ہوتے ہیں۔ وہ تمام اعتراضات جو علماء کرام کی تفسیر میں واقع ہوئے ہیں وہ اس مفہوم میں ازخود رفع ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہیں رہتا ہے۔ اس کے بعد اب آپ خود غور فرمائیں کہ ہمارے فقہائے کرام نے صرف ایک لفظ کی غلط تعبیر سے کس طرح کی لغزش کھائی ہے اور لطف یہ ہے کہ سب فرقوں کا اس پر اتفاق ہے اور سب

فرقوں کی فقہ میں یہی قوانین رائج ہیں۔ اس ایک کیس سے آپ خود اندازہ فرما لیں کہ ہماری فقہ کا کتنا حصہ قرآن کریم کے خلاف ہوگا۔

اسی طرح اس بات کا بھی خیال فرمائیں کہ ہمارے علماء کرام کی ایک لغزش کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ کس طرح بے انصافی ہو رہی ہے۔ چند سال پیشتر بی۔بی۔سی لندن نے ایک پروگرام کئی مرتبہ دکھایا۔ راقم سطور نے بھی وہ پروگرام لندن میں کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ معلوم نہیں یہاں پاکستان میں بھی وہ دکھایا گیا یا نہیں۔ اس پروگرام میں دکھایا گیا تھا کہ ایک نابینا عورت سے Rape کیا گیا اور گواہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسی نابینا عورت کو سزا ہوئی اور وہ عورت جیل میں زندگی گزار رہی تھی۔ اس فلم کو دیکھ کر لندن میں مسلمان بہت شرمندہ ہوتے تھے لیکن وہ بی۔بی۔سی والوں کو روک نہیں سکتے تھے البتہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ قرآن کریم میں اس طرح کا قانون کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر سمجھدار آدمی یہ بات محسوس کرتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس قدر شنیع فعل لوگوں کی موجودگی میں نہیں کر سکتا۔ تو بھلا اس کے لئے چار عینی گواہ کس طرح مل سکتے ہیں اس قسم کے احکامات کو قرآن کریم کی طرف منسوب کرنے سے قرآن کریم کی توہین ہوتی ہے اور ہمیں حد درجہ اس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت' بہ منبر نتواں گفت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

مسئلہ جنات

(پہلی قسط)

کفِ آ بگینہ

یہ 83-1982ء کی بات ہے کہ ایک محترم کے ساتھ بعض مناقشاتی مذہبی مسائل پر خط و کتابت شروع ہوگئی۔ راقم کا آخری مکتوب کافی طویل تھا۔ جس میں ایک نزاعی مسئلہ' جنات کے بارے بھی زیر بحث آیا۔ قرآن حکیم کی رو سے اس عاجز کا مناطِ دعویٰ یہ تھا کہ انسانوں کو ہی ان کی بعض خصوصیات کی بنا پر جنات کہا گیا ہے۔

یہ مرتبہ آرٹیکل اس ناچیز کے اسی موقف کا فشردہ (Compendium) ہے۔ زیرِ نگاہ مجمل سے مضمون میں 'خذما صفا ودع ما کدر' کے زریں ضابطے کو مدنظر رکھتے ہوئے' غایت درجہ بے تعصبی سے ہر قسم کے مخالف موافق مسالک کے علمی لٹریچر سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ تحریر کے عمومی ارتجال مزاج کی مناسبت سے متداول تحقیقی اصولوں کے مطابق بعض مقامات پر باقاعدہ حوالہ جات کا اہتمام نہیں کیا جا سکا' جس پر معذرت قبول فرمائی جائے۔

غالباً 93-1992ء میں اس مستنبط مضمون کی کتابت کا خیال آیا چنانچہ اسی زمانے میں کفا جفا یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ جانے پھر بھی کیوں اس کی طباعت و اشاعت کی نوبت نہ آ سکی؟ اب دو چار روز قبل سالہا سال بعد پرانے کاغذات کی چھان پھٹک کے دوران مذکورہ مسودہ مل گیا۔ از سرِ نو پڑھا تو کسی قدر حک و اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا یہ تالیف معمولی ترمیم و تبیّض کے ساتھ ''طلوع اسلام'' کے لئے ارسال کی جا رہی ہے۔ توقع ہے توجہ سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔

باقی اس خاکسار کو اپنی Derivations کے لئے حرفِ آخر' کا پرکشش عنوان منتخب کرنے کا ہرگز شوق نہیں ہے۔ یہاں تو بس دعاؤں/ آرزوؤں کا مرکزہ (Nucleus) یہی ہے کہ نظری اصابتوں اور فکری بصیرتوں میں پیہم اضافہ ہوتا چلا جائے۔

جدید مادی ترقیات' عقل انسانی کی مثبت ارتقائی منازل پر شاہدِ ناطق ہیں۔ لیکن جب ہم ذہن انسانی کے حوالے سے مثبت انقلابی تبدیلیوں کا اثبات کرتے ہیں تو اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ لمحۂ موجود میں کائنات کے تمام انسانوں کے اذہان اس سطح پر پہنچ گئے ہیں جس مقام پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ (Educated Elite) اور باشعور سائنسدانوں کی عقول رسائی حاصل کر چکی ہیں۔ تفکر' تعقل اور تدبر کی اساسات پر مبنی جدید عمرانی رجحانات کے رائج و مقبول ہو جانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ جملہ مشارق و مغارب میں بسنے والی کل اقوام و ملل نے علیٰ وجہ البصیرت اپنے اجتماعی شعور (Collective Consciousness)

کو اس مثالی مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ طاقور Magnifying Lens سے بھی جہل دور دور تک نظر نہیں آتا۔ بلکہ شعور، وقوف، آگہی، فہم، ادراک، عقل، خردافروزی اور علم کا ارتقا توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی، پوجا پاٹ، جہالت اور بے عقلی کے تمکن و بقا پر بین برہان ہوتا ہے۔

اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ آج سے ہزاروں برس قبل اگر کچے مکانات تعمیر ہوتے تھے تو آج بھی ہو رہے ہیں۔ آج سے قرنہا قرن پیشتر بت پرستی ہوتی تھی تو یہ فعلِ شنیع آج بھی جاری ہے۔ لیکن اس کے باوصف یہ جاروبی بیان نہیں دیا جاسکتا کہ اعلیٰ آسمانی تعلیم، درسِ توحید اور تہذیب وتمدن کا ارتقائی عمل رک گیا ہے۔ یعنی جدید علوم وفنون اگر کسی حصۂ کائنات کو مثالی معاشرہ بنا دیں تو ان بہترین اور بلند پایہ اصول وضوابط کی منور صداقت کے علی الرغم ایک محدود حلقے یا علاقے میں ہی ان کی کارفرمائی نظر آسکتی ہے۔ پوری کی پوری دنیا کبھی بھی علم وعقل کے جگمگاتے ہوئے ہیرے کی شوخ شعاعوں کو محفوظ نہیں کرسکی۔ چنانچہ یہ کلیہ تاریخِ انسانی میں مسلمہ حقیقت بن کر تر از و رہا ہے کہ اس ارض کا معتد بہ حصہ ہمیشہ جاہل رہا ہے۔

علم اور جہل دونوں قوتوں میں مبارزت ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی۔ لیکن اس کے نسبت تناسب میں کمی یا بیشی کا گہرا تعلق ایک درجہ میں شرح خواندگی اور ایک درجہ میں وحی ربانی کی ضیا کے ساتھ ضرور رہا ہے۔ جس ملک، قوم یا معاشرے میں علم کی فرمانروائی ہوگی، ذہن کو آزادی اور فراخی کی نعمتیں نصیب ہوں گی وہاں تصوراتی مافوق الفطرت عناصر سے مرعوبیت چمتکاریوں اور شعبدہ بازیوں کی شرح بہت کم ہوگی۔ کیونکہ یہ طے ہے ہر دہلیز کے پتھر کو دیکھتے ہی جھک جانے والے لوگ دین سے بہرحال دور اور مذہب کے قریب ہوتے ہیں۔ اس امر میں کلام نہیں کہ تحیر انگیز خوارق، محیر العقول واقعات اور فہم وشعور سے دور اعتقادات بالعموم مذہب کی راہ سے عامتہ الناس میں مقبول ہوتے ہیں اور پھر جس قدر استمرار (Continuation) کے ساتھ ان معتقدات، واقعات اور حالات کو بیان کیا جائے گا، اسی قدر عوام کالانعام کے قلوب و اذہان میں ان فرسودہ نظریات کے متعلق ''ایمان'' راسخ ہوتا چلا جائے گا اور جب یہ عقائد اس درجہ عام ہو جائیں کہ بچے بچے کی زبان پر ان کا ذکر ہو تو پھر ان معتقدات کی صداقت، میں کسی قسم کے شبہ کو ایمان میں ذلت اور ایقان میں تزلزل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یوں اس سوسائٹی میں ان عقائد کے بے سروپا مجموعے کو ''عالمگیر سچائی'' کا معزز ٹائٹل مل جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ''باغی ذہن'' یعنی آزاد سوچ کا مالک مذہبی پیشوائیت کی بیان فرمودہ ''مسلمہ سچائیوں'' پر

ناقدانہ نظر ڈالنے کا گناہِ کبیرہ کر بیٹھے تو ''الراسخون فی الایمان'' کی طرف سے پہلی اور آخری ناصحانہ دلیل یہی پیش کی جاتی ہے۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا جاتا ہے' میاں! تم آج اٹھ کر صدیوں پرانی صداقت پر تنقید کر رہے ہو' کیا ہمارے اور تمہارے باپ دادا کم عقل اور کم فہم تھے جو ان اعتقادات کی لِم اور حقیقت پر کامل ایمان رکھتے تھے؟ لیکن یہ استدلال کس درجہ پوچ ہے اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ آج۔۔۔ ہزاروں برس قبل بھی اسی جذباتی خمیر سے اس ''دلیل'' کی بنیاد اٹھائی جاتی تھی اور آج سے ہزاروں برس قبل بھی اس ''برہان'' کا رد اس انداز و اسلوب میں کیا جاتا تھا:

و اذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالو بل نتبع ما الفینا علیہ اباء نا او لو کان اباوھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون (2/170)۔

''ان لوگوں کے پاس اپنے غلط نظام کی سند صرف یہ ہے کہ یہ نظام ان کے اسلاف سے متوارث چلا آ رہا ہے۔ سوچئے کہ یہ بھی کوئی سند ہے؟ یاد رکھو! غلط اور صحیح۔ حق اور باطل کی سند اور معیار صرف یہ ہے کہ خدا کی کتاب کا کیا فیصلہ ہے۔ لیکن یہ کبھی اسے معیار تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو' تو یہ کہیں گے کہ نہیں! ہم اسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔۔ یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے صحیح راستے پر گامزن ہوں' یہ پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے''۔

یہ درست ہے کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں توہم پرستی کا ایک حد تک استیصال (Extermination) ہو چکا ہے۔ کہنہ اوہام و اباطیل کسی حد تک مٹ چکے ہیں اور مزمن لایعنی رسوم و رواج کا تسلط اب اعتقادات کی دنیا میں بہت زیادہ قائم نہیں رہا لیکن ہمارے برعظیم کا اعجوبہ پسند ذہن اکیسویں صدی کے آغاز پر بھی خرافات پرستی میں بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ آپ کو آج بھی قدم قدم پر کشتگانِ تعویذات اور جنات زدہ مخلوقات کے' ہجوم نظر آئیں گے۔ کوئی آستانوں کی چوکھٹوں پر اپنی ناک گھسا رہا ہے' کوئی اولاد کی خواہش لئے بیری کے مخصوص درخت کے نیچے چادر بچھا کر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی بے ہودہ عاملین کی جیبیں گرم کر کے اپنے جن نکلوا رہا ہے۔ ان عاملوں کی گرم بازاری' کائیاں پن اور ابلہ طرازی صدیوں سے قائم ہے اور شاید

صدیوں تک قائم رہے گی کہ ہم خود عقل کے ازلی دشمن ہیں۔

فی الاصل یہ انسان کے اندر کا ناگہانی خوف (Groundless Fear) ہے جسے خارجی واقعات (جن کی کنہ وحقیقت کی تفہیم سے اس کا محدود ذہن قاصر ہوتا ہے) اور تقویت پہنچاتے ہیں۔ آسمانی بجلی کی دل ہلا دینے والی کڑک پر جب لرز اٹھتا ہے تو بے اختیار کسی پیر فقیر کو مدد کے لئے پکارتا ہے کیونکہ اس نے بچپن سے ہی سن رکھا ہے کہ باباجی نے اپنے خصوصی اعجاز سے برقِ سماوی کو اپنے لوٹے میں قید کر لیا تھا اور پھر اس عفیفہ کی مسلسل منتوں ترلوں سے ان کا دل پسیج گیا تھا اور یوں موصوفہ کی رہائی عمل میں آئی تھی۔ باباجی کے ایسے ہی معجزات اسے ان کے مزار کی خاک چاٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسے اندھی عقیدت کے راستے ملنے والے اسی مذہب سے مجنونانہ پیار ہے اور یوں ''فطری'' طور پر وہ اللہ اور اس کے آخری رسول ﷺ کے عطا فرمودہ دین سے بیزار ہے۔ کیونکہ مذہب میں قصے ہیں' قوالیاں ہیں' ڈھولک کی تھاپ ہے' ہارمونیم ہے' شعبدہ بازیاں ہیں' کرشمہ زائیاں ہیں' کرامات ہیں' رنگین روایات ہیں' جادوٹونا ہے' عملیات ہیں غرض خانقاہی مزاج کی حکمرانی ہے جبکہ دین میں مسلسل جہاد ہے' نظامِ صوم وصلوٰۃ ہے' ذات کی نشوونما کا ''بے ترس'' عمل ہے' اعلیٰ معاشرتی نظام کی پیہم پابندی ہے' مستقل قدروں کی پاسداری ہے غرض قوانین خداوندی کی یکسر ''بے رنگ'' تعمیل ہی تعمیل ہے۔ لہٰذا عبد کے بنائے ہوئے مذہب کی رنگا رنگ تازگی کا معبود کے نازل کردہ دین کی خشک اطاعت سے کیا مقابلہ؟

انسان بے چارہ طبعاً کمزور ہے۔ تخویف اور تحریص (Dread & Lust)' بس ان دو اساسی اسباب کا وجود اس کے جسم اور اس کی روح کو لرزا اور للچا دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ خصوصاً اگر پس پردہ موسیقی میں ضعیف الاعتقادی کی دلفریب دھنوں کا اہتمام ہو تو کیا کہنے۔ روحانی جلب وتحصیل کے لئے پیر' فقیر' مزار' دربار کے سامنے سجدہ کرنے میں ذرا تاخیر نہیں کرے گا۔ بہادر پیر سائیں کا جلال اور قہر وغضب اسے آناً فاناً بھسم کر کے نہ رکھ دے۔ ٹیلی پیتھی' مسمریزم' ہپناٹزم' عمل تنویم اور قوتِ ارتکاز (Concentration) ایسے دسیوں فنون صوفیانہ اصطلاحات کے مقدس چولے پہن کر جب اس کے سامنے آتے ہیں تو طرفۃ العین میں ایمان ترقی کی ان گنت منازل طے کر جاتا ہے۔ مذکورہ فنون میں طاق عاملوں کے قدموں میں خلقِ خدا کا لوٹنا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ایسے میں یہ ''صاحب ایمان'' اس ارفع طاقت' مسبب الاسباب خدا کو بھول جائے گا جس کی قدرتوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے جب بھی دنیا میں اللہ تعالیٰ

کے مامورین آئے اس نے ان کی صداقت کو پرکھنے کے لئے جھٹ معجزات ہی طلب کئے۔ گویا اس کی نگاہ میں Criterian of Truth سدا معجزہ ہی رہا ہے۔ کبھی اس نے کہا: جناب! اپنے اعجاز سے ان پہاڑوں کو سامنے سے ہٹا دو۔ کبھی مطالبہ یہ کیا: محترم! ہمارے مرے ہوئے باپ دادوں کو زندہ کر دو۔ کبھی یوں لب کشائی کی: مکرم! اگر آپ اپنے دعویٰ ماموریت میں صادق ہیں تو آپ کے ساتھ پروٹوکول کے لئے ایک فرشتہ ضرور موجود ہونا چاہئے جو وقفے وقفے سے آپ کی سچائی کا ضروری اعلان کرتا رہے اور ہمیں مشاجرہ و منازعت سے روکتا بھی رہے۔ کبھی زبان کے گیلے فرش پر اس تقاضے کا رقص شروع ہو جائے گا۔ حضرت! اگر آپ واقعی خدا کی جانب سے ہیں تو ہمارے لئے فوراً بڑے بڑے باغات اور پرشکوہ محلات کیوں نہیں بنا دیتے ہاں ایسے محلات جن میں کل آسائشیں حاضر ہوں۔ لگتے ہاتھ خزانے، چاندی، سونے اور ہیرے جواہرات سے بھی بھر جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ اس طرح آپ کا بھی بھلا ہو جائے گا یعنی آپ کو تلاش معاش کی خاطر بازاروں کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے۔ اچھا ہمارے محبّ! اگر آپ یہ سب کچھ کرنے کی استعداد نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں، آپ یوں کیجئے آسمان کا کوئی ایک آدھ ٹکڑا ہی ہم پر گرا دیجئے یا پھر کچھ ایسا کیجئے کہ آپ کی تائید میں خدا اور ملائکہ ہمارے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اگر یہ مظاہرہ بھی آپ سے سرزد نہیں ہوسکتا تو ایک اور آپشن آپ کو دی جاتی ہے کہ آپ سب کے سامنے ایک سیڑھی کی وساطت سے آسمان پر تشریف لے جائیے اور پھر اسی زینے کے توسل سے فرشتوں کی معیت میں واپس آجائیے۔۔۔!

اب طنز کے زہر میں بجھے ان لغو ترین مطالبات کے جواب میں خدا کے مامور نے کہا کیا؟ انہوں نے بڑے ہی وقار کے ساتھ یہ وضاحت کی: بھئی! میرا دعویٰ بس یہ ہے کہ اس خدائے بزرگ و برتر کا کلام میرے سینے پر نازل ہوتا ہے۔ میں تو وحیٔ ربانی کے نور میں اس بگڑے ہوئے سماج کو اعلیٰ معاشرتی قدریں سکھانے آیا ہوں تاکہ تم اپنے حقیقی خالق کو فراموش نہ کر دو، تمہارے اندر توقیرِ آدمیت کا مثبت جذبہ پیدا ہو اور سوسائٹی میں امن، سکون، تحفظ، نظم وضبط اور خوشحالی ایسی نعمتیں جنم لیں۔ باقی رہے تمہارے نامعقول مطالبات، تم تو سابقہ مامورین کو بھی انہی عجیب وغریب مطالبات کی وجہ سے جھٹلا چکے ہو اور میں بھی گزشتہ انبیاء کی طرح محض ایک نبی ہوں اور نبی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ ذریت انسانی سے ہٹ کر کسی الگ مخلوق کا باشندہ ہوتا ہے بلکہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ چنانچہ تمہارے اعتراض ھل ہذا الا بشر مثلکم (یہ تو تمہارے جیسا انسان ہے) کے جواب میں میں یہی کہتا ہوں ھل

کنت الا بشر رسول (میں تو صرف بشر رسول ہوں) اورانما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی (میں صرف تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں فرق صرف یہ ہے کہ میری طرف وحی نازل کی جاتی ہے۔[1] اور یہ کہ حقیقت میں تمہارے جیسا انسان ہوتے ہوئے بھی تم جیسا نہیں ہوں اور تم مجھ جیسے انسان ہوتے ہوئے بھی مجھ جیسے نہیں ہو۔ کبھی غور کرو! تمہارے اور میرے مابین مابہ الامتیاز پہلو کیا ہے؟ سنو! وہ بس یہ ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں' خدا میرے ساتھ کلام کرتا ہے' خدا براہ راست میری تربیت کرتا ہے اور یہ امتیازی اوصاف تمہیں نہیں ملے اس لئے تم اب صرف اور صرف میرے توسط سے خدا تک آؤ کیونکہ اس نے خود مجھے تم لوگوں پر معلم مقرر کیا ہے۔ گر تمہارے سمع و بصر اور فواد اس بات کی کامل شہادت دیتے ہیں کہ نور نبوت کے واسطہ سے جو شعور' جو تعلیم تم تک پہنچائی جا رہی ہے وہ تمہارے لئے مفید ہے' تفکر و تعقل پر مبنی ہے تو تم اسے دل و جان سے قبول کرلو ورنہ انکار کر دو' تم پر کوئی تقیید اور قدغن نہیں (لا اکراہ فی الدین) اچھا جب جی چاہے قبول کرلو اور جب من میں آئے انکار کر دو۔ میری طرف سے تم پر کوئی تلوار نہیں لٹک رہی۔ لیکن یاد رکھو بہت اچھی طرح تسلیم کر لینے میں بہرصورت تمہارا ہی فائدہ ہے۔ خدا پر یا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے۔ اس لئے کہ قبولیت تم پر سلامتی کے در وا کر دے گی ہاں تم قوانین الٰہیہ سے ہم آہنگ ہو جاؤ گے۔ فرحت و راحت' نشاط و انبساط' مسرت و بہجت کے ساتھ زندگی بسر کرو گے۔ ورنہ محض تمہارے اوٹ پٹانگ مطالبات کی خاطر خدا اپنے قوانین اور ضوابط کو نہیں توڑے گا۔ یہی میرا طریقہ ہے' یہی پہلوں کا دستور تھا۔ شعبدہ بازیوں سے دین کے پروگرام کو قبول کرنے کی دعوت دینا تو کبھی بھی مامورین ربانی کا اسلوب نہیں رہا۔ بھلا چند کم عقلوں کی خاطر خدا اپنے متعین قوانین کو کیوں توڑے گا؟ گویا یہ (معجزاتی) طریق تبلیغ ہی منشائے الٰہی کے معارض ہے۔

یہ ہے تلخیص اللہ کے مامورین کے طرز دعوت کی۔ ابتدائے اسلام میں حضور نبی کریم ﷺ کی پیروی میں مسلمان مجاہدین نے اسی انداز کو اپنایا۔ وہ لوگ سراپا عمل تھے۔ نتائج کو پیش کرتے تھے۔ سبب اور نتیجے کے بیچ جو رشتہ ہے' اس کا عرفان منتقل کرنا' ان کی مرکزی ڈیوٹی تھی اور یہی ڈیوٹی وہ برابر ادا کرتے رہے۔ پھر ہوا کیا؟ تاریخ نے ایک موڑ کاٹا۔ دین اسلام جب ان علاقوں میں پہنچا جہاں ''جادوگری'' ہی لوگوں کا دین تھی۔ وہاں بوجوہ تربیت کا عمل اپنے کمال کو نہ پہنچ سکا۔ ان خطوں میں بسنے والوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کے حوالے سے محیر العقول واقعات' مافوق الفطرت روایات اور ہوشربا قصے مشہور کر رکھے تھے اور اس اثاثے پر ازحد فاخر تھے۔ تو سادہ لوح مسلمانوں کو بھی خوب جوش آیا اور ''نیک نیتی''

[1] مزید تصریح کے لئے آئندہ قسط میں تکملہ ''بشریت انبیاء'' ملاحظہ فرمائیے۔

سے انہوں نے بھی اپنے ماضی کو ٹٹولا۔ اس عمل میں طالع آزما سامریوں کا تعاون انہیں حاصل ہوگیا۔ ادھر ملوکیت نے دین کو رسمی عبادات کا مجموعہ بنانے پر کام شروع کر رکھا تھا' ادھر روایات سازی کی ٹکسالیں ایک نئی متوازیت کو جنم دے رہی تھیں۔ نتیجہ معلوم اساطیر اور قصص نے شبانہ روز فروغ پانا شروع کر دیا۔ عملیت بے عملیت میں تبدیل ہوگئی۔ اب ''اسلامی طلسمات'' کا سرمایہ فرومایہ نہیں تھا' سر اٹھا کر اپنی بلندی کا اظہار کر سکتا تھا۔ سو اس نے جی بھر کر کیا۔ روایات سے شکتی حاصل کر کے جو تفاسیر ہمارے اسلاف نے تحریر کیں ان میں اعجوبہ پسندی کی تائید کے لئے اتنا مواد مہیا کر دیا گیا کہ ہم خود کفیل ہو گئے۔ اب قرآن مجید میں پوری سورۃ جن موجود تھی۔ لفظ جن بھی متعدد مقامات پر موجود تھا۔ واقعات بھی تھے' سو سبحان اللہ جو جو حاشیہ آرائیوں کے امکانات تھے' سب کے سب بروئے کار لائے گئے۔ بس کیا عرض کریں یہ داستان بڑی طویل ہے۔

بہرحیث ہم ایک بار پھر قرآن مجید سے کسی توسط پر انحصار کئے بغیر رابطہ قائم کر کے دیکھتے ہیں کہ وہاں جنات کی کیا پوزیشن ہے؟ تاکہ جھاڑ جھنکاڑ سے دامن بچاتے ہوئے بلاواسطہ ہدایت پا کر کچھ جانا پرکھا جائے' یقیناً قرآن ہمیں روشنی سے محروم نہیں رکھے گا۔ ہمیں بس ماورائیت پرستی کی رنگین دھند کو چیر کر براہ راست اس آفتاب سے تعلق قائم کرنا چاہئے جو راہنمائی کا سب سے بڑا پاور سٹیشن ہے۔ اس طرح رہبری نئے زاویوں سے ہمارے شعور کو نئے آفاق سے روشناس کرے گی۔ آزمائش شرط ہے۔

واذ صرفنا الیک نفراً من الجن یستمعون القران فلما حضروہ قالوا انصتوا فلما قضی ولوا الی قومھم منذرین۔ قالوا یٰقومنا انا سمعنا کتٰباً انزل من بعد موسیٰ مصدقاً لما بین یدیہ یھدی الی الحق والیٰ طریق مستقیم۔ یٰقومنا اجیبوا داعی اللہ و اٰمنوا بہٖ یغفرلکم من ذنوبکم و یجرکم من عذاب الیم۔

''اے رسول! اگر یہ شہری آبادیاں تمہاری دعوت کی مخالفت کرتی ہیں تو اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے تمہیں تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ جن میں شہری اور دیہاتی' مہذب اور غیر مہذب' صحرانشین سب شامل ہیں۔ دیہاتی اور صحرانشین بدو اس کی طرف متوجہ ہوتے جا رہے ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے تمہاری طرف صحرانشینوں کی ایک جماعت کو متوجہ کیا تھا تاکہ وہ قرآن کو سنیں۔

چنانچہ جب وہ تمہاری مجلس میں جہاں قرآن کا بیان ہو رہا تھا' آئے' تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ وہ اسے نہایت خاموشی سے سنیں۔ جب وہ بیان ختم ہوگیا تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس گئے تاکہ انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کریں۔

انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا کہ ہم ایک ایسی کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰؑ کے بعد (محمدؐ پر) نازل ہوئی ہے۔ وہ ان تمام باتوں کو سچ کر دکھانے والی ہے جو کتاب موسیٰؑ میں بیان ہوئی تھیں۔ وہ حق کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور انسان کو وہ راستہ دکھا دیتی ہے جو اسے سیدھا منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

انہوں نے کہا کہ اے ہماری قوم کے لوگو! تم اس داعی الی الحق کی دعوت کو قبول کرو اور جس طرح وہ کہتا ہے اس کے مطابق خدا پر ایمان لاؤ۔ وہ تمہاری لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہیں الم انگیز تباہی سے بچا لے گا''۔ (46/29-31)۔

صاحبو! مندرجہ بالا مفہوم میں ''نفراً من الجن'' کا ترجمہ ''صحرانشینوں کی ایک جماعت'' بیان کیا گیا ہے جو یقیناً قرآنی منشا کو بڑی عمدگی سے پیش کر رہا ہے۔ لیکن خیر ہم تھوڑی دیر کے لئے ان کو ''جنوں میں سے کچھ لوگ'' مان لیتے ہیں تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ اس بنیادی آیت میں جن/ جنات کے حقیقی معنی کیا ہیں؟

مفسرین نے قرآنِ مجید کے مذکورہ بیان سے جو اہم تر نتائج اخذ کئے ہیں ان میں سے یہ چار زیادہ قابل توجہ ہیں۔

۱۔ یہ نظریہ بالبداہت غلط ہے (جو آج بھی عامتہ الناس میں رائج ہے) کہ انبیاء کرام میں سے جنات صرف حضرت سلیمانؑ سے متعلق تھے۔ بالفاظ دیگر جناب سلیمانؑ کا ہی جنات پر تصرف تھا۔

۲۔ نزولِ قرآن تک بہرصورت ''جنات'' کا وجود ثابت ہے۔ لاکھوں برس قبل پیدا ہو کر یہ مخلوق یکسر ناپید نہیں ہوگئی تھی۔

۳۔ جنات صرف خاتم الانبیاﷺ کی قرآنی تعلیمات سے ہی متاثر نہیں ہوئے یہ حضرات اچھے خاصے ''خواندہ'' معلوم ہوتے ہیں کہ انہیں تورات کے پیغام اور صاحبِ تورات جناب موسیٰؑ سے بھی خواب واقفیت ہے۔

۴۔ کیا جنات شریعتِ الٰہیہ پر کاربند ہونے کے مکلّف تھے؟ یا وہ ''رضاکارانہ'' ایمان لائے تھے؟

☆☆☆

گویا ان آیات کی روشنی میں اس مروجہ نظریے بلکہ عقیدے کی واضح لفظوں میں تردید ہوگئی کہ جنات پر تصرف جناب سلیمانؑ ابن داؤدؑ کا ہی طغرائے امتیاز تھا۔

مطلب یہ کہ حضرت سلیمانؑ کا ہی یہ ما بہ الامتیاز وصف نہیں کہ وہ قومِ جنات پر قدرت و اختیارات رکھتے تھے اور مرسلین کی تعلیمات پر بھی جنوں کا ایمان لانا ثابت ہے۔ جیسا کہ سورۃ احقاف کی مذکورہ آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ رسول برحق حضرت محمد ﷺ کی زبان اطہر سے قرآن کی تلاوت سماعت کر کے انہوں نے ان آیات ربانی کی سچائی پر یہ مبسوط استدلال قائم کیا کہ یہ اللہ کی کتاب تورات کے بعد نازل ہوئی ہے۔ موسیٰؑ اور ان کی مبارک تعلیم کو من جانب اللہ ثابت کرتی ہے اور اسی دلیل محکم کو بنیاد بنا کر انہوں نے پہلے اپنے قلوب کو اطمینان کی ثروت سے مالا مال کیا بعد ازاں انہوں نے اپنی قوم میں نئے دین (اسلام) کی تبلیغ کی۔

باوجود یہ جنات (بادیہ نشین) Educated نہیں تھے لیکن ظالم سخن شناس ضرور تھے:

دیکھئے سورۃ جن کی ابتدا ہی ان آیات سے ہوتی ہے جن میں جن کلامِ الٰہی کی دلآویزی اور معنویت کے نہایت معترف نظر آتے ہیں:

قل اوحی الی انه استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قراٰنا عجبا یهدی الی الرشد فامنابه ولن نشرك بربنا احداo

''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ مجھے بذریعہ وحی بتایا گیا ہے کہ ایک غیر مانوس بادیہ نشین قبیلہ کی ایک جماعت نے دوسروں سے چھپ کر قرآن سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب وغریب چیز سنی ہے۔ جو کچھ ہم نے سنا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ بالکل سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں قرار دیں گے''۔ (72/1-2)۔

بے طرح جی چاہ رہا ہے کہ آیت نمبر 15 تک مسلسل ترجمہ یہاں Quote کیا جائے تاکہ حقیقی اعتراف کی سچی زبان کے ذائقے سے وہ قوم آگاہ ہو سکے جسے ''انسان'' ہونے پر اتنا فخر ہے کہ محض Homo Sapien ہونے پر خود کو اشرف المخلوقات قرار دیتے نہیں تھکتی۔ لیکن کیا کریں طوالت کا احساس مانع ہے۔ توفیق ملے تو مفہوم القرآن' سے خود رابطہ قائم کر لیں۔ یہ درست ہے کہ سورۃ نمل اور سورۃ سبا میں ان جنات کا مفصل تذکرہ ملتا ہے جن سے حضرت سلیمانؑ نے مفید کام لئے۔ لیکن جنات سے تعلق کا اختصاص حضرت سلیمانؑ کی ذات تک محدود کر لینا قرآن سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اوپر سورۃ احقاف اور سورۃ جن کی آیات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ جنات آپ ﷺ کی شخصیت اور تعلیمات سے بھی متاثر ہوئے۔

اب ہمیں نہیں معلوم کہ وہ عوامل کیا ہیں جو ہمارے اکابر زدہ مفسرین کو برابر مجبور کرتے رہے ہیں کہ انہوں نے حضرت سلیمانؑ کے اقتدار کو چیونٹیوں' پرندوں اور جنات تک پھیلا دیا اور رسول کریم ﷺ کو صرف نوعِ انسان تک محدود رکھنے میں مصلحت سمجھی۔ اٹھایا جانے والا یہ سوال بھی اپنی جگہ خاصا وزنی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جن جنات کو قابو کیا ہوا تھا وہ بڑے قوی ہیکل' مقتدر' توانائیوں کے مالک تھے۔ ایک جن نے تختِ شیبا طرفتہ العین میں لا حاضر کیا۔ چند جنات اورنگِ سلیمانؑ کو طیارے کی طرح فضاؤں میں اڑائے پھرتے تھے۔ علمی و ادبی صلاحیتوں میں یہ جنات اور ان کے مریدینِ باصفا بھی (حتیٰ کہ طیور بھی) کچھ کم نہیں ہیں کہ ایسے ایسے اسرارِ غامضہ' معارف نادرہ' نکاتِ جدیدہ' حقائق عجیبہ اور مطالب لطیفہ ''بیان'' فرماتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب آپ ﷺ کی ذات عمیم البرکات پر ایمان لانے والے جنات کا تذکرہ آئے گا تو وہ جن بے چارے بڑے ہی عاجز و درماندہ' پا افتادہ اور ناصیہ فرسا نظر آتے ہیں کہ شب دیجور میں ملتے ہیں اور وہ بھی چھپ چھپا کر اور طلوع آفتاب سے قبل غائب ہو جانے میں عافیت جانتے ہیں مبادا کسی کو ان کے قبول ایمان کی خبر ہو جائے اور وہ مشکل میں گرفتار ہو جائیں۔ یہ تفاوت کیوں؟

ضمناً یاد آیا کسی نے یہ بڑا لطیف نکتہ پیش کیا ہے جن اگر کوئی غیر مرئی مخلوق تھے ایسی مخلوق جو عام انسانوں کو نظر نہیں آ سکتی تو ان جنات کو شبِ دُجیٰ میں آپ ﷺ سے ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو دن کی روشنی میں بھی بآسانی آ سکتے تھے۔ کوئی انہیں کیونکر کسی قسم کا گزند پہنچا سکتا تھا؟

اس مقام پر ایک اصولی آیت کی تفہیم ناگزیر ہے۔

لتومنو باللہ و رسولہ و تعزروہ و توقروہ و تسبحوہ بکرۃ و اصیلا۔

''اور جماعتِ مومنین اس نظامِ خداوندی کی محکمیت پر یقین کامل رکھے جو اس کے رسولؐ کی وساطت سے متشکل ہو رہا ہے۔ اور اس کے قیام و استحکام کے لئے اس رسولؐ کی مدد کرے اور اس کی عظمت و توقیر کو بلند کرے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر وقت کوشاں و سرگرداں رہے''۔ (48/9)۔

یہی تاکید پرزور الفاظ میں سورۃ اعراف کی آیت نمبر 157 اور سورۃ احزاب کی آیات 41+42 میں بھی کی گئی ہے۔ مزید غور کیا جائے تو ''درود'' کا قرآنی مفہوم بھی یہی ہے کہ قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے حضور ﷺ کی مدد کی جائے۔ یعنی حکومتِ الٰہیہ کو قائم کرنے کی مخلصانہ سعی ہی فی الاصل ''درود'' ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا' فرمانِ مبارک ہے کہ مجھے جس قدر مصائب ونوائب کا سامنا کرنا پڑا ہے کسی اور نبی کو نہیں کرنا پڑا۔ فی الواقعہ آپ ﷺ کی حیاتی کا معتد بہ حصہ طرح طرح کی ایذائیں برداشت کرتے' جنگی اسفار کرتے بیتا ہے۔ ایسے ایسے ابتلا برداشت کئے کہ انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی اذیتیں اس درجہ ستاتی ہیں کہ تقاضائے بشری کے سبب آپ ﷺ رو پڑتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے ''سرورِ دو عالمؐ کی حیاتِ اقدس کے چند نازک لمحات'' مرتبہ محمد کلیم ارائیں)۔

کتاب الرقاق' مشکوٰۃ جلد دوم میں حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کی راہ میں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لئے وہ کچھ کیا گیا کہ کسی دوسرے کے لئے نہیں کیا گیا۔ اللہ کی راہ میں مجھے اتنا دکھ دیا گیا ہے کہ کسی دوسرے کو نہیں دیا گیا اور مجھ پر تیس دن رات مسلسل ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلالؓ کے لئے کوئی ایسا کھانا مہیا نہ ہو سکا جسے جاندار کھاتے ہوں..... بجز اس شے کے جسے چھوٹی سی پوٹلی بنا کر بلالؓ اپنی بغل میں داب لیتے''۔

یہ طُرفہ تماشا ہے کہ آپؐ کے صحابہؓ جو آپؐ کی نصرت میں اپنی جانب سے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے' انسان ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی بے بس سے ہو جاتے تھے۔ مسلسل جدوجہد کو اگرچہ انہوں نے شعار بنا رکھا تھا لیکن قرآنی معاشرے کا خواب جب پورا ہوتا انہیں دکھائی نہیں دیتا تھا تو وہ اللہ اور اس کے نبی ﷺ کے سامنے پکار اٹھتے تھے۔ مگر دیکھئے اللہ نے کس رنگ میں مداخلت کی ہے:

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلو من قبلکم مستهم الباساء والضراء و زلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنو معه' متی نصر الله الا ان نصرالله قریب o

''وحی کی راہنمائی تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دینا چاہتی ہے لیکن چونکہ اس سے انفرادی مفاد چاہنے والوں کے مقاصد پر زد پڑتی ہے اس لئے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا اس جنتی معاشرہ کے قائم کرنے کے لئے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔۔۔ سوائے جماعتِ مومنین! تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اس معاشرہ کو یونہی قائم کر لو گے اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی ان جاں گداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس انقلاب آفرینی کی کوشش کی۔ سختیاں

اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارالہا! ہماری کوششوں کی بارآوری کا وقت کب آئے گا؟ ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوتیں اور تائید ایزدی ان کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔ تمہیں بھی انہی مراحل میں سے گزرنا ہوگا''۔(2/214)۔

دوستو! قائلینِ جنات سے کہئے کہ آسمانی کلام میں موجود زمینی حقائق پر اک نظر ڈالیں پھر ٹھنڈے دل سے غور کر کے بتائیں کہ کسی نازک گھڑی میں ایمان لانے والے جنات نے آپ ﷺ یا آپؐ کے صحابہؓ کی مدد کی ہے؟ ذاتی حیثیت میں ان کے کبھی کام آئے ہیں؟ قرآنی معاشرہ قائم کرنے میں کبھی ان کی عون و اعانت کی ہے؟ جنگوں میں آپ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ ہی لڑتے رہے۔ حتیٰ کہ شہادت کے جام بھی آپ ﷺ کے جانثاروں کو ہی پینے پڑے۔ کسی مومن جن کو توفیق نہ ہوئی کہ غزوۂ احد میں کفارِ مکہ کے لشکروں کو ایسا سبق سکھا دیتا کہ وہ کم بخت دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ ایک طرف جنات کو غیر معمولی قوتوں کی مالک غیر مرئی مخلوق ثابت کرنے پر کل زورِ کلام صرف کر دیا جاتا ہے' پھر ان میں سے بعض ایمان کی دولت سے سرفراز بھی ہو جاتے ہیں۔ انہیں بھی اس طرح حکم ملتا ہے کہ اپنے قائد اپنے نبی ﷺ کی مدد کرو' مگر وہ بڑے لاچار جن ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ شعبِ ابی طالب میں محصوری کے تلخ ایام' ہجرت کا دلدوز سفر' جنگیں' فاقے' معاشی تنگی۔۔۔ غرض کون سی کلفت ہے جس کا آپ ﷺ کو سامنا نہیں کرنا پڑا' پر مجال ہے جو کسی جن نے آگے بڑھ کر اپنی Services پیش کی ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ نرالی اور متصورہ صفات و اوصاف والی ایسی کوئی مخلوق موجود نہیں ہے جو ''جن'' کی مزعومہ تعریف پر پوری اترتی ہو۔ طلسماتی اور جادوئی انداز میں حضور ﷺ کی ایسی کوئی مدد بھی نہیں ہوئی۔ رہے حضرت سلیمانؑ و حضرت موسیٰؑ کے جنات' بھلے وہ ہیوی ویٹ تھے' قوی الجثہ تھے' طاقتور تھے' Hardy تھے' جفاکش تھے' فعال تھے' تھے بہرحال وہ بھی انسان۔ ان کی نصرت اور معاونت ''دائرہ انسانیت'' کے اندر ہی رہی تھی۔

☆☆☆

سورۃ احقاف کی آیت کے حوالے سے جن چار نتائج کا ذکر کیا گیا تھا ان میں دوسرے نمبر پر یہ نکتہ درج کیا گیا تھا:

''نزولِ قرآن تک بہرصورت جنات کا وجود ثابت ہے۔ لاکھوں برس قبل پیدا ہو کر یہ مخلوق یکسر ناپید نہیں

ہوگئی تھی''۔

اب سوال یہ ہے کیا جنات سے مراد انسانوں کا ہی ایک مخصوص گروہ ہے یا الگ سے کسی اور مخلوق کو بھی قرآنِ مجید نے 'جن' قرار دیا ہے؟

اس تناظر میں اصحابِ علم نے قرآن مجید کی ان آیات کی جانب متلاشیانِ حق کی توجہ مبذول کی ہے:

والجان خلقنه من قبل من نار السموم۔

''اور ہم نے جان (یعنی جنات کو) اس سے پہلے تیز آگ سے پیدا کیا''۔(15/27)

و خلق الجآن من مارج من نار۔

''اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔ (55/15)۔

ابلیس کان من الجن۔

''ابلیس' جنوں میں سے تھا۔(18/50)۔

قال ما منعک الا تسجد اذا مرتک قال انا خیر منه خلقتنی من نار و خلقته من طین۔

''خدا نے فرمایا' کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟ کہا' اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا' اسے مٹی سے۔

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیہات کی بات

(جناب حسن نثار اور محترم عبدالقادر حسن کو دیہات میں خوش آمدید)

محترم حسن نثار صاحب اپنے گاؤں میں آ گئے اور محترم عبدالقادر حسن صاحب روز نامہ جنگ ۲۰ جون ۲۰۰۵ء کے اپنے کالم میں لکھتے ہیں ''میں گاؤں جا رہا ہوں'' اہل دیہات کو ایسے دانش ور قلم کاروں کی ضرورت ہے۔

'' کچھ یاد نہیں پڑتا کہ کتنا عرصہ ہوا میں گاؤں نہیں گیا اس دوران بے پناہ بارشیں ہوئیں کھیت اور پہاڑ سبزے سے بھر گئے مگر میں لاہور کے بیاباں میں ہی رہا۔ اس سے پہلے کہ میں اس پرسکون زندگی کو بھول جاؤں اور ایک اجنبی بن کر اس گاؤں میں جاؤں جس کی مٹی سے پیدا ہوا ''پلا'' بڑھا۔ لاہور کی آلائشوں کو پرے جھٹک کر یہاں سے چند دنوں کے لئے ہی سہی بھاگ کیوں نہ جاؤں۔ مجھے صبح کے وقت گاؤں سے باہر چراگاہوں کی طرف جاتے ہوئے وہ مویشی بھول رہے ہیں جو اپنے قدموں کی اڑائی ہوئی خاک میں دھندلے سے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی گردنوں پر لٹکتی ہوئی گھنٹیاں ان کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ جنگلی جانور بھولتے جا رہے ہیں جو راتوں کو انسانوں سے بچ بچا کر تالابوں میں پانی پینے آتے ہیں اور چند گھونٹ پی کر گردن اونچی کر کے ادھر ادھر دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں اور پھر پانی پینے لگ جاتے ہیں۔ وہ ہرن جو پانی کے تالابوں کی تلاش میں کئی پہاڑیاں پھلانگ کر کہیں پیاس بجھانے میں کامیاب ہوتے ہیں پھر وہ تیتر اور چکور جو صبح صبح جنگلی پودوں کے پتوں سے شبنم کے قطرے چن چن کر ان سے اپنے گلے تر کرتے ہیں اور بولیاں بولتے ہیں۔ چاندنی راتوں کی خاموشی جس سے لاہور کے شور وغل کے عادی لوگوں کو ڈر لگتا ہے' ستاروں بھرا آسمان جو گاؤں میں ہی دکھائی دیتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ یہ سب اور بہت کچھ بھول نہ جاؤں اور دل کے خوابوں کی دنیا بے آباد نہ کر بیٹھوں''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''مسلسل محنت کا نام زندگی تھا۔ رزق حلال سو فیصد' چوری چکاری بدکاری ناپید ایک صاف ستھری بالکل سادہ سی زندگی''۔ اب بجلی اور ٹیلی فون سے دیہات یقیناً جدید دیہات کا درجہ حاصل کر لیں گے۔ آخری فقرہ ملاحظہ ہو ''میں چشم تصور سے ہی سہی اس شاندار زندگی کی کسی جھلک کی تلاش میں گاؤں جا رہا ہوں'' ؎ اے کامدنت باعثِ آبادیٔ ما

میں محترم حسن نثار صاحب اور محترم عبدالقادر حسن صاحب کو گاؤں میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اور دعوت دیتا ہوں کہ وہ باغبانی کی طرف مائل ہوں اور باغبان ایسوسی ایشن کے لئے کوئی تاریخی کردار ادا کر کے دیہات کی تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوائیں۔

پتہ برائے رابطہ:

۱۔ ملک حنیف وجدآنی۔ صدر باغبان ایسوسی ایشن۔ سنبل سیداں۔ نیومری۔

۲۔ صبینہ یاسمین۔ سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن۔ ٹبی سیداں۔ سوہاوہ۔ جہلم۔

۳۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر۔ (تاحیات ممبر) باغبان ایسوسی ایشن۔ ۳۳سی۔ ۲۔ گلبرگ III۔ لاہور۔

LETTERS OF PARWEZ TO QUAID-I-AZAM

(The letters below were wailed to us by Mr. Maqbool M. Farhat. He is the former representative of the London branch of Tolu-e-Islam. We are very grateful to him for his services. These letters are preserved in the archives of Jinnah Papers, which were collected by Yawar Hussain Zaidi (ستارۂ خدمت) under the direction of the Government of Pakistan. ***Editor***)

==========

37 Turkman Road, New Delhi,

23rd March 1947

Respected Quaid-i-Azam,

I was in Bengal during January-February and came to the Punjab at the end of the last month. I am now returning to Delhi in a day or two. I shall be grateful if you will kindly let me know (at my above address) whether you intend coming to Delhi in the near future or propose staying at Bombay for some time more.

You are perhaps aware that I am on leave from my office since September last.

I hope you are enjoying the best of your health.

With all respects,

Yours Obediently,

G.A. Parwez

???????

(Zaidi, p.377-SK)

(Yawar Hussain Zaidi was professor of History at F.C. College Lahore)

****

37 Turkman Road, New Delhi,
8 May 1947

Respected Quaid-i-Azam,

Kindly excuse me for making this encroachment on your valuable time, especially when you are so busy these days. A friend of mine, Khan Mohammad Aslam Khan of Mardan (N.W.F.P), has sent me the enclosed cheque with the request that I should make it over to you personally. You perhaps know this gentleman. He was the Private Secretary to the late Nawab Sir Abdul Qayyum. He presented to you the address at Mardan when you last visisted that Province. He is a pious and quiet sort of fellow. The way in which this money should be spent, he leaves at your discretion. If you do not mind, kindly send him the acknowledgment direct. His address is given on the chit enclosed with the cheque.

2. I have been getting alarming news about the high-handedness of the military and the police in the western districts of the Punjab, deputed to investigate into the recent riot affairs. The position there is very serious and I would request you kindly to issue special instructions to the League people in the Punjab to devote their special attention to the matter, if they have not already done this. Rawalpindi District is specially to be mentioned.

3. Kh. Abdur Rahim, I.C.S., Punjab, has written to me to say that he would be coming to Delhi to discuss with me and then with you certain important questions regarding the "distribution" [*sic* for division] of the Punjab. He will be here on the 10th of this month and desires to see you on the 11th. I know it is difficult for you to make appointments these days beforehand and he should therefore take his chance when he comes; but in case you can conveniently spare some time for him, kindly ask Mr. Khurshid to note it down so that we could ascertain from him about it on due date.

4. I have a personal matter to discuss with you whenever convenient to you. Can I expect the favour of a few minutes any time it is possible for you to spare? Or, if you do not mind, I could accompany Mr. Rahim on the 11th.

With all respects and sincere prayers,

Yours Obediently,
G.A. Parwez

???????

(Zaidi, p.712-3-SK)

****